

امامت قرآن و حدیث کی روشنی میں

<"xml encoding="UTF-8?">

مقدمہ

قارئین کرام! "امامت" کے موضوع پر بہت زیادہ بحث و گفتگو ہوئی ہے یہاں کہ اس سلسلہ میں ہزاروں کتابیں لکھیں جاچکی ہیں۔

اور متعدد مؤلفین نے اس سلسلہ میں بہت سی فروعات پر تفصیلی گفتگو کی ہے چنانچہ بعض مؤلفین نے کچھ پہلوؤں پر گفتگو کی ہے تو بعض دیگر مؤلفین نے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالی ہے، کیونکہ بعض مؤلفین نے بحث امامت کو قرآن کی روشنی میں بیان کیا اور بعض دیگر مؤلفین نے امامت کو حدیث کی روشنی میں، تو بعض مؤلفین نے امامت کو علم کلام کی روشنی میں بیان کیا تو کسی نے تاریخ کی روشنی میں اور کسی نے امامت کی بحث کو وقت وفات النبی سقیفہ کے حدود میں بیان کیا ہے تو بعض لوگوں نے ائمہ (ع) کی سوانح حیات اور ان کی تاریخ بیان کی ہے، چنانچہ آج تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری و ساری ہے۔

چونکہ اس سلسلہ میں لکھی گئی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن پھر بھی بعض لوگوں نے تعصب اور خود غرضی کے تحت اس موضوع کی حقیقت ہی کو بیان نہیں کیا، لہذا بہت سی کتابیں اسی تعصب اور کج فکری سے بھری پڑی ہیں چنانچہ اسی تعصب کا نتیجہ ہے کہ ان کتابوں میں ایسے مسائل بیان کئے گئے ہیں جن کو عقل و منطق قبول نہیں کرتی۔

یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے بحث امامت کو اس طرح پیش کیا ہے جس میں ہوا پرستی اور خیالی تصورات کے علاوہ کچھ نہیں پایا جاتا اور ان میں نہ تو امامت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور نہ ہی ایسے نکات کو بیان کیا گیا جو بین المسلمین متفق علیہ ہوں، جبکہ ان نظریات کا سبب صرف یہی کتابیں ہیں جو اصل موضوع سے خارج ہیں۔

لہذا اب ہم صاف طور پر بیان کرتے ہیں :

"ہم چونکہ آج امامت کی بحث کرنا چاہتے ہیں جبکہ "سقیفہ" کو چودہ صدیاں گزر گئیں ہیں پس یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم اختلاف کر رہے ہیں اور جب اختلاف کرتے ہیں (جیسا کہ بحث کرنے والوں کا وطیرہ رہا ہے) تو ہم پر تعصب اور زیادہ روی کی تہمت کیوں لگائی جاتی ہے؟! جبکہ اختلاف رائے سے کسی واقعہ کی حقیقت نہیں بدلتی۔"

تو کیا اس موضوع کے بارے میں ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے معاصر انسان مطمئن ہو جائے اور اپنے دل میں موجودہ شبہات کا حل تلاش کر لے؟۔

یا اس سلسلہ میں کچھ ایسے موارد ہیں جن کی وجہ سے انسان دھوکا کھاجاتا ہے یا جن کی وجہ سے نوع بشر کو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے؟

آج دنیا بھر کے تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ آج ہمارے سامنے کوئی امام حاضر نہیں ہے، جو ان میں اختلاف کا باعث ہو مثلاً بعض لوگ اس کی بیعت کریں اور بعض اس کی بیعت سے انکار کردیں، اور اسی وجہ سے ایسا کوئی جھگڑا نہیں ہے جس سے انسان ڈرے یا اس سلسلہ میں کچھ کہنے والا کسی سے خوف

کہاجائے۔

شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو:

”جب باتیں کچھ اس طرح ہیں تو اس گفتگو، بحث اور رجد جہد کا کیا فائدہ؟“

جواب:

ہم اس سلسلہ میں اسلام کا حقیقی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو نظام زندگی ہے اور ہم اس اہم اور خطرناک موضوع کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات کا صاف اور واضح جواب پیش کریں، چنانچہ اس سلسلہ میں چند اہم سوال اس طرح ہیں:

۱۔ اسلام کی نظر میں ”امامت“ کے کیا معنی ہیں؟

۲۔ کیا ”امامت“ ضروری ہے اگر ضروری ہے تو کیسے؟

۳۔ کیا واضح طور پر کسی کو منصب ”امامت“ پر منصوب کیا گیا ہے یا انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے؟

۴۔ کیا ”امامت“ منصوص ہے؟ ٹیوقراطی ہے؟، یا ڈکٹاٹوری؟، یا ڈیموکراٹک؟ ہے؟

ان سوالات کے علاوہ اور دیگر پہلو بھی ہیں جن کے بارے میں حقیقت کو واضح کرنے کے لئے عمیق بحث کی ضرورت ہے تاکہ اس اہم مسئلہ میں اسلامی نظریہ واضح ہو جائے۔

چنانچہ ہم اس باب میں ایسی روش اختیار کریں گے جس سے ہمارے قارئین کرام اسلامی فرقوں میں موجودہ نظریات میں سے صحیح نظریہ کا انتخاب کر لیں، اور ادھر ادھر نہ بھٹکنے پائیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وفات کے بعد کے حالات سے بعض مسلمانوں کے احساسات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے لہذا ہم ان کو بیان نہیں کریں گے۔

ہماری ساری امید خداوند عالم کی ذات ہے کیونکہ وہی ہماری مدد کرنے والا ہے اور ہمارے لڑکھڑاتے ہوئے قدم میں ثبات پیدا کرنے والا ہے اور وہی مذکورہ باتوں کے بیان کرنے میں نصرت و مدد کرنے والا ہے خداوند! ہمارے قلم کو سہو و خطا سے محفوظ رکھ اور ہمیں اس راستہ پر چلا جس میں تیری مرضی ہو، او رہمارا قول و فعل تیری مرضی کے مطابق ہو، انہ خیر مسدد و موفق و معین۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

امامت کے عام معنی

امام کے معنی اپنی قوم کے آگے چلنے والے رہبر اور مقتدی کے ہیں (جیسا کہ عربی لغت میں آیا ہے)۔ [1] لہذا امامت کے معنی قیادت اور ریاست کے ہیں، اسی وجہ سے نماز پڑھانے والے کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دوسروں سے آگے ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اسی لغوی معنی کو استعمال کیا گیا ہے؛ ارشاد ہوتا ہے:

[2]

”خدا نے فرمایا کہ میں تم کو (لوگوں کا) پیشوا (امام) بنانے والا ہوں“

[3]

(اور اس سے قبل جناب موسیٰ کی کتاب (توریت) جو لوگوں کے لئے پیشوا اور رحمت تھی“

[4]

”اور ہم کو پڑھیزگاروں کا پیشوا بنا“

[5]

”اس دن کو یاد کرو جب ہم تمام لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔“

اسی طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ پر لفظ ”امام“ استعمال ہوا ہے۔

معنی خلیفہ: جیسا کہ عربی لغت بیان کرتی ہے : امیر، سلطان اعظم او راہنے سے ماقبل کے جانشین کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔[6]

لہذا خلافت کے معنی امارت، سلطنت اور کسی کے قائم مقام کے ہیں۔

اور اسی معنی میں قرآن مجید میں لفظ ”خلیفہ“ ، ”خلائف“ اور ”خلفاء“ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

[7]

”میں (اپنا) ایک نائب زمین میں بنانے والا ہوں“

[8]

”اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں (اپنا) نائب قرار دیا“

[9]

”اور وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے زمین میں (اپنا) نائب بنایا“

[10]

”اور (وہ وقت) یاد کرو جب اس نے تم کو قوم نوح کے بعد خلیفہ (وجانشین) بنایا“

قارئین کرام ! ان کے علاوہ بھی دوسرے مقامات پر ان الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

چنانچہ علماء اہل لغت لفظ ”امامت“ او ”خلافت“ کے مذکورہ معانی پر متفق ہیں لیکن علماء کلام نے اس سلسلہ میں اختلاف کیا ہے کہ ان دونوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں یا ان کے الگ الگ معنی ہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں نے امامت کی اس طرح تعریف کی ہے:

”امامت، نبی کی اس خلافت کو کہتے ہیں جس میں دین اور نظام دنیا کی محافظت کی جاتی ہے۔“ [11]

خلافت کے بارے میں ابن خلدون صاحب کہتے ہیں:

”خلافت کو تمام مسلمان شرعی طور پر آپس میں طے کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی مشکلات کا حل تلاش کیا جاسکے۔“ [12]

اور اسی بات کی تاکید کرتے ہوئے موصوف کہتے ہیں:

”خلافت وہ دینی منصب ہے جو امامتِ کبریٰ کے تحت ہوتا ہے“ [13]

ایک صاحب نے اس طرح ان دونوں (خلافت و امامت) میں رابطہ بیان کرتے ہوئے کہا:

”خلافت امامتِ کبریٰ ہے او امامتِ نماز ؛ امامتِ صغریٰ ہے۔“ [14]

قارئین کرام ! جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ دونوں لفظ ایک ہی مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور شاید ”ریاست“ و ”قیادت“ مذکورہ معنی میں سب سے جامع معنی ہوں جن پر ان دونوں الفاظ کے معنی

متفق ہیں۔

لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قیادت و ریاست میدان عمل میں کس طرح وقوع پذیر ہوئی تو ہم اس سلسلہ میں واضح فرق دیکھتے ہیں او رایک متکلم دوسرے متکلم سے الگ نظریہ پیش کرتا ہے اور اس طرح سے ان دونوں الفاظ کے معنی کرتا ہے کہ ان دونوں میں بہت زیادہ فرق دکھائی دیتا ہے۔ لہذا طے یہ ہوا کہ امامت کے معنی دینی ریاست کے ہیں جیسا کہ دینی نصوص بھی اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور خلافت کے معنی حکومت کی ریاست کے ہیں جیسا کہ اس بات پر بھی نصوص دینی اشارہ کرتی ہیں۔

چنانچہ شیعہ وسنی محققین کے نزدیک ”امام“ صاحب حق شرعی کو کہا جاتا ہے جبکہ خلیفہ ؛ صاحب سلطنت کو کہا جاتا ہے۔ [15] چنانچہ اس لحاظ سے حضرت ابوبکر کی خلافت، سلطنت حکومت تھی ، دینی سلطنت نہیں۔ [16]

اسی وجہ سے ان دونوں الفاظ کے لئے ایک خاص میدان اور معین دائرہ ہے۔

اس اختلاف کے باوجود ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ دونوں منصب ایک شخص میں جمع ہونے چاہئے جیسا کہ مذکورہ نصوص سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ اسلامی نظریہ کے مطابق دین و سیاست (حکومت) میں جدائی نہیں ہے۔

اور جیسا کہ یورپی ممالک سے یہ نظریہ (دین کا سیاست جدا ہونا) ہم تک پہنچا ہے اور بعض حکومتوں میں ”چرچ“ (گرجا گھر) لوگوں کے عام امور میں دخالت کرتا ہے کیونکہ عیسائی نظام ؛ حکومت اور روش حکم کو قبول نہیں کرتی، لیکن ہم مسلمانوں کے لئے شعار کو قبول کرنے میں کوئی بھی عذر نہیں ہے کیونکہ ہمارا دین در حقیقت، رسالت دین اور نظام حکومت ہے۔ [17]

لہذا ضروری ہے کہ دین و حکومت کی ریاست ایک ہی شخص میں جمع ہوں کیونکہ اگر دونوں جدا جدا ہوں تو پھر نہ ہی نظام دین چل سکتا ہے او ر نہ ہی نظام حکومت۔

لیکن مسلمانوں کے درمیان بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا ماننا یہ ہے کہ امامت جدا ہے ، اور خلافت جدا، اور اس نظریہ کے لئے مسلمانوں کی تاریخ عملی کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے جبکہ مسلمانوں میں امامت ، خلافت سے جدا رہی ہے اور مرجع دینی رئیس حکومت کے علاوہ رہا ہے کیونکہ یزید بن معاویہ جو خلیفہ تھا لیکن مسلمانوں کا امام نہیں تھا او ر نہ ہی مسلمان، دینی مسائل اور عقائد میں اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ قارئین کرام ! شیعوں کی نظر میں ”امامت“ رسالت کا ایسا جز ہے جس کے ذریعہ رسالت کامل ہوتی ہے او ر اس کا وجود جاری و ساری رہتا ہے، چنانچہ عقل بھی اس بات کا حکم کرتی ہے کیونکہ امامت لطف ہے او ر ہر لطف خدا پر واجب ہے جیسا کہ علم کلام میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

امامت لطف کیوں ہے؟ تو اس کے جواب میں یہ عرض کیا جائے گا کہ چونکہ لطف اس شیء کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان خدا کی اطاعت سے قریب، اس کی نافرمانی سے دور اور راہ حق پر گامزن رہتا ہے او ر حقیقت بھی یہی ہے کہ امامت کے ذریعہ مذکورہ معنی متحقق ہوتے ہیں (یعنی انسان امامت کے ذریعہ خدا کی اطاعت سے قریب اور اس کی نافرمانی سے دور ہوتا ہے) جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مبسوط الید (صاحب طاقت و قدرت) قائد جس کی لوگ اطاعت کریں تو وہ ظالم کو نابود کرنے والا، مظلوم کے ساتھ انصاف کرنے والا اور لوگوں کے امور کو اخلاص و ایمان کے ذریعہ منظم کرنے والا نیز لوگوں کو ہوا و ہوس او ر انانیت سے باہر نکالنے والا ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے انسان خدا کی اطاعت سے قریب، معصیت و برائی سے دور اور اس راہ پر گامزن

ہوجاتا ہے جس کو خداوندعالم نے پسندکیا ہے، اور یہی معنی ہیں ”لطف“ کے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قدیم زمانے سے آج تک تمام قوم وقبیلہ کا ایک رئیس اور سردار رہا ہے جس کے ذریعہ اس قوم کے مسائل حل ہوتے ہیں اور اپنے لئے دستور وقوانین معین کئے جاتے ہیں چنانچہ آج کا سماج بھی رئیس اور حکومت کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے کہ کوئی ایسی حکومت ہو جو انسانی زندگی کے تمام امور مثلاً: سیاست، اقتصاد، عدالت، تربیت اور لشکری امور کو بہترین طریقہ سے انجام دے۔

چنانچہ اسلام کی نظر میں حکومت کی ریاست کے لئے وسیع نظر ہے اس لحاظ سے کہ دین او ر دنیا دونوں امور میں اسی کا حکم نافذ ہونا چاہئے وہ امور جن کو شریعت اسلام نے پیش کیا ہے جن میں اسلامی مناطق میں تمام طور وطریقہ کو بیان کیا گیا ہے، چاہے وہ انسان کا خدا سے رابطہ ہو یا انسان کی اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ہو۔

او ر چونکہ انسانی سماج کے قوانین انسان کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور زمان و مکان کے لحاظ سے قابل تبدیل ہوتے ہیں لیکن اسلام کا قانون ایسا نہیں ہے کیونکہ آسمانی دین میں تغیر وتبدیلی نہیں ہوتی، لیکن دین اسلام کے مکمل اور کامل ہونے کے ساتھ ساتھ بعض بنیادی اصول میں نصوص بہت زیادہ واضح نہیں ہیں لہذا ضروری ہے کہ مکمل طریقہ سے ان مسائل کی تشریح اور وضاحت کی جائے۔۔

قارئین کرام ! جو دلیل نبوت کی ضرورت پر دلالت کرتی ہے وہی دلیل امامت کی ضرورت پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ نبوت کا وجود بغیر امامت کے نامکمل ہوتا ہے او راگر امامت کو نبوت سے جدا مان لیا جائے تو یہ حقیقت اسلام کے منافی ہے کیونکہ رسالت کا قیامت تک باقی رہنا ضروری ہے، پس: زندگی کا آغازنبوت ہے ۔

اور امامت اس حیات کا برقرار رکھنا ہے۔

اگر ہم امامت کو چھوڑ کر صرف نبوت کی بات کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبوت ورسالت کا زمانہ معین ہے اور رسول کی حیات کے بعد باقی نہیں رہ سکتی او راپنے اہداف کی تکمیل اور استمرار کے لئے کسی وصی کو بھی معین نہیں کرسکتی (جب تک خدا کی مرضی نہ ہو)

اور چونکہ اسلام کا ہدف ومقصد ایک ایسی حکومت ہے جو تمام انسانوں کو ، اختلاف وطن و رنگ کے باوجود ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے، لہذا ضروری ہے کہ اسلام اس ہدف کی خاطر رسول جیسی زندگی رکھنے والے شخص کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمکی وفات کے بعد قیادت اور رہبری کا انتظام کرے۔

خلاصہ گفتگو:

در حقیقت منصب امامت، معنی نبوت کوکامل کرنے والا ہے او رنبی کا وجود بغیر امامت کے عملی طور پر مکمل نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح نبوت ضروری ہے اسی طرح امامت بھی ضروری ہے، جس طرح خدا پر نبوت واجب ہے اسی طرح امامت بھی واجب ہے اور اس کے لئے بہترین سند اور بہترین دلیل درج ذیل مشہور ومعروف حدیث رسول ہے:

”من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتةالجاهلیة“

(جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو پہچانے بغیر مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے)

اور جب امامت کا ہونا ضروری ہے تو کیا اسلام نے مسلمانوں کو اس چیز کا اختیار دیا ہے کہ وہ اس امام کا انتخاب کریں جو اس عظیم اور اہم ذمہ داری کو سنبھالے یا منصب امامت کا انتخاب الہی نصوص کے ذریعہ ہوتا ہے اور نبی کے ذریعہ معین کیا جاتا ہے۔

چنانچہ شیعہ اور اکثر معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ امام کے لئے ضروری ہے کہ اس کو خود نبی منصوب کرے اور نبی بذات خود اس کو معین کرے۔

جس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں:

چونکہ امامت، نبوت کا استمرار ہے لہذا اس میں بھی نبوت کی طرح تعین خاص کی ضرورت ہے جس سے یہ کشف ہو جائے کہ خداوند عالم نے اس منصب کو اختیار کیا ہے اور خدا اس سے راضی ہے۔

پس جس طرح نبوت بھی انتخاب اور شوری سے نہیں ہوسکتی اسی طرح امامت بھی شوری کے انتخاب سے نہیں ہوسکتی۔

اور یہی وہ راستہ ہے جو امامت و امام کے مسئلہ میں ثابت اور معین ہے لیکن دوسرے اسلامی فرقوں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص راستہ نہیں اپنایا۔ [18]

بلکہ کہتے ہیں جو شخص بھی امامت کا متولی ہو گیا اور اپنے کو امام تصور کرنے لگا تو وہ امام ہے چاہے اس متولی کو انتخاب کے ذریعہ بنایا گیا ہو جیسے ابوبکر، عثمان، حضرت علی (ع) اور امام حسن (ع) کے لئے ہوا، اور تاریخ اسلام میں ان کے علاوہ کسی کا انتخاب نہیں ہوا، یا اپنے سے ما قبل نے ان کے بارے میں وصیت کی ہو جیسا کہ عمر بن خطاب اور اکثر خلفائے اموی، عباسی اور عثمانی کے لئے ہوا ہے یا چاہے طاقت کے بل بوتہ کی بنا پر ہو جیسے معاویہ بن ابی سفیان اور ابو عباس السفاح نے کیا ہے۔

چنانچہ شیعہ حضرات تعین امام کے بارے میں نص کی ضرورت پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ ارشاد قدرت ہے:

[19]

”اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) منتخب کرتا ہے۔“

کیونکہ یہ آیت واضح الفاظ میں دلالت کرتی ہے کہ دین و شریعت کے محافظ و نگہبان کی ذمہ داری خداوند عالم پر ہے، بندوں کو اس سلسلہ میں ذرا بھی اختیار نہیں دیا، اور اس موضوع میں فقط و فقط خداوند عالم ہی کو اختیار ہے۔

لیکن بعض لوگوں نے اس استدلال پر اعتراض کیا کہ اس آیت میں جس اختیار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف نبوت سے مخصوص ہے اور اگر امامت کے بارے میں بھی کوئی یہی کہے تو اس کا یہ قول قابل قبول نہیں ہے۔

لیکن جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ مذکورہ آیت کے صدر و ذیل میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس میں اختیار کو انبیاء (ع) سے مخصوص کر دیا جائے بلکہ آیت مطلق اختیار کی بات کر رہی ہے اور کسی بھی طرح کی کوئی قید اور تاویل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ امامت وہی نبوت کا استمرار ہے، اور امامت، رسالت کو مکمل کرنے والی ہے لہذا جب نبوت کے اختیار کا حق صرف خدا کو ہے تو پھر امامت میں بھی اختیار صرف خداوند عالم کی ذات ہی کو ہونا چاہئے۔

اور حق بات تو یہ ہے کہ اگر روایات و احادیث کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وصیت بھی ثابت نہ ہو تو صرف عقل ہی اس وصیت کو ثابت کرنے کا حکم کرتی ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی ایک بھی اس

بات پر راضی نہیں ہوگا کہ اگر موت قریب ہے تو اگرچہ مال و دولت اور اولاد کم ہو ، کہ ان کے بارے میں وصیت نہ کریں بلکہ ہر انسان ایسے موقع پر کسی کو اپنا وصی بناتا ہے تاکہ وہ اس کے بعد اس کی اولاد اور مال و دولت کا خیال رکھے۔

تو کیا پھر وہ نبی اعظم جو اتنی عظیم میراث (اسلام) کو چھوڑ کر جارہا ہو تو کیا وہ اپنی اس میراث کا کسی کو وصی نہیں بنائے گا، تاکہ وہ اس کی محافظت کرے اور اس میں صحیح طریقہ سے تصرف کر سکے۔؟! حضرت رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وفات کے وقت موجودہ قرائن سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے وصیت فرمائی اور اپنی میراث کو لاوارث نہیں چھوڑا تاکہ وہ زمانہ کے حوادث و بلاء میں گرفتار نہ ہوجائے۔

وہ اسلام جس نے دنیا کے تمام مسائل میں احکام و قواعد معین کئے ہیں انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھی ہو؛ خرید و فروخت ہو یا حوالہ و کفالہ، اجارہ و وکالت ہو یا مزارعہ و مساقاۃ، قرض و رہن ہو یا نکاح و طلاق، صید و ذباحہ ہو یا اطعمہ و اشربہ اور چاہے حدود و دیات ہو یا دیگر مسائل ، جب ان سب کو بیان کردیا تو کیا وہ اس اہم مسئلہ امامت کو نہیں بیان کرے گا؟!

کیونکہ مسئلہ امامت اتنا اہم ہے جس کے ذریعہ امت اسلامی کی قیادت اور رہبری ہوتی ہے اور جس چیز کا آغاز خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا ہے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ وہ اسلام جو اپنے احکام میں عدالت و مساوات اور مسلمانوں کے لئے اطمینان کا خیال رکھتا ہے جو ہر خوف سے امان دیتا ہے اور انسان کے اعضاء و جوارح کو ایسی طاقت عطا کردیتا ہے جس سے خیانت، فتنہ و فساد اور برائیوں سے اپنے نفس کو روک لیتا ہے تو کیا اسلام بغیر امام کے اس عظیم ہدف تک پہنچ سکتا ہے؟! کیونکہ امام کی لوگوں کو گمراہی سے نجات دینے و لاتاہے اور بے عدالتی کو ختم کرتا ہے کیونکہ بے عدالتی سے حاکم فاسد ہوجاتا ہے اور حاکم کے فاسد ہونے سے انسانی نظام اور دین فاسد ہوجاتا ہے لہذا ان تمام برائیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے امام کی ضرورت ہے جس میں تمام صفات کمال موجود ہوں، ہر برائی سے پاک و پاکیزہ ہو، اور اپنے قول و فعل میں ہر طرح کی خطا و غلطی سے محفوظ ہو، ہم اسی چیز کو عصمت کہتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ ان تمام صفات کے حامل شخص کا انتخاب ہونا ضروری ہے جو کسی معمولی شخص میں جمع نہیں ہوسکتیں، تو پھر نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ امت کے سامنے اس منصب کے بارے میں بیان دے، اور صاف طور پر لوگوں کو بتائے کہ میرے بعد فلاں امام ہے۔

اور یہ عصمت جس کے بارے میں ہم نے اشارہ کیا کوئی عجیب چیز نہیں ہے جیسا کہ بعض اسلامی فرقوں خصوصاً یورپی مؤلفین کا عقیدہ ہے بلکہ یہ تو حاکم کے شرائط میں سے ایک اہم شرط ہے، اور وہ بھی ایسا حاکم جس کا کام قرآن کی تفسیر کرنا اور اسلام کے غیر واضح مسائل کی شرح کرنا ہے، کیونکہ عصمت کے معنی عرب میں ”منع“ کے ہیں [20]

اور اصطلاح میں بھی معنی مراد لئے جاتے ہیں یعنی عصمت ایک نفسانی ملکہ (قوت) ہے جو انسان کو فعلی معصیت اور ترک طاعت سے منع کرے اور اس کی عقل و شعور پر احاطہ رکھے تاکہ اس کو ہر طرح ہوشیار رکھے اور اس سے کوئی بھول چوک نہ ہو اور اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جس سے خدا ناراض ہو۔ کیونکہ معصیت کا مرتکب قرآنی اصطلاح میں ظالم ہوتا ہے:

”اور جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہے بوہی لوگ تو ظالم ہیں“
[22]

”اور جو خدا کی حدوں سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا“
[23]

”یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ (بہتان) باندھا، سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے“
[24]

”پھر ہم پرہیزگاروں کو بچائیں گے اور نافرمانوں کو اس میں چھوڑ دیں گے“
اسی طرح قرآن مجید میں دیگر مقامات پر اس مضمون کی آیات موجود ہیں۔

اور یہ عاصی (گناہگار) جس کو قرآن مجید نے ”ظالم“ کہا ہے اس کو کوئی بھی شرعی ذمہ داری جو دین و شریعت اور خداوندعالم سے متعلق ہو؛ نہیں دی جاسکتی، اور اس بات پر قرآن مجید نے واضح طور پر بیان دیا ہے، ارشاد خداوندعالم ہوتا ہے:
[25]

”(اے رسول اس وقت کو یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور (جب) انہوں نے پورا کر دیا تو خدا نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا (امام) بنانے والا ہوں (جناب ابراہیم نے عرض کی اور میری اولاد میں سے بھی، فرمایا (ہاں مگر) میرا یہ عہدہ ظالمین تک نہیں پہنچ سکتا“
اس آیت کی تفسیر میں فخر رازی صاحب کہتے ہیں:

”یہ بات ثابت ہے کہ اس عہد سے مراد امامت ہے کیونکہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کوئی فاسق شخص امام نہیں ہوسکتا، تو بدرجہ اولیٰ رسول نہ فاسق ہوسکتا ہے اور نہ ہی گناہ اور معصیت کرسکتا ہے۔ [26]

اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ ”عصمت“ کے معنی اور شرائط امامت، عجیب و غریب نہیں ہیں بلکہ یہ وہ معنی ہیں جس کے ذریعہ شرعی نصوص اور روح دین مکمل ہوتی ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر احمد محمود صبحی مسئلہ ”عصمت“ پر شیعوں کے عقیدہ پر حاشیہ لگاتے ہوئے کہتے ہیں:
”تمام سیاسی فلاسفہ جس وقت کسی حکومت کی بڑی ریاست کی بات کرتے ہیں یا کسی دوسرے بڑے عہدے کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہیں تو اس کو شبہات و اعتراضات سے بالاتر قراردیتے ہیں، اسی طرح وہ سیاسی فلاسفہ جو ”ڈکٹیٹری“ (Dictatory) اور کسی حکومت میں حاکم کی سب سے بڑی ریاست کے قائل ہیں وہ اس کے لئے بھی عصمت کے قائل ہیں اگرچہ دوسرے صفات بھی اس میں ضروری مانتے ہیں۔
اسی طرح ”ڈیموکراسی“ (Democracy) کے فلاسفہ بھی اس کے شعبوں اور قواعد و قوانین میں عصمت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ”ان تمام ریاستوں کے لئے عصمت کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کا نظام قائم ہو اور ان کے ماتحت افراد ان کی تائید کریں“

”تمام سیاسی نظام میں باوجود اختلاف ایک ایسی ریاست کا وجود ہوتا ہے جس میں تمام احکام میں اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور کسی بھی فرد کو حاکم یا قانون گزار نہیں بنایا جاسکتا ہے جب تک کہ اس میں قداست اور عصمت نہ پائی جائے لہذا صرف شیعہ ہی عصمت کے قائل نہیں ہیں جس سے کسی شخص کو تعجب ہو، اگرچہ شیعہ حضرات نے ہی عصمت کے بارے میں بحث شروع کی ہے لیکن وہ اس نظریہ میں تنہا نہیں ہیں بلکہ دوسرے افراد بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں“ [27]

قارئین کرام ! جیسا کہ مذکورہ باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعوں نے اپنے احساسات یا ہمدردی کی بنا پر کسی معین شخص کا انتخاب نہیں کیا اور نہ ہی کسی سیاست سے کام لیا بلکہ انہوں نے نص و روایات سے وہ چیزیں حاصل کی ہیں جس میں حیات صحیح اور بناء سلیم [28] کا ذریعہ پایا جاتا ہے اور وہ اس نظریہ کا دفاع کرتے ہیں جو ایمان، اسلام او اخلاص کی جان ہے اور اس سے ہدف اور شعورِ مصلحت تک پہنچا جاسکتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ نص کی ضرورت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کی بات کی تائید درج ذیل نکات سے واضح ہوجاتی ہے:

۱. نص کا ہونا، اس انسانی شعور و فطرت کے مطابق ہے جو انسان کے وجود میں موجود ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے ماورائے غیب (خدا) کے محتاج ہونے کی ضرورت کا احساس کرتا ہے کیونکہ تمام امور میں اسی ذات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ (یعنی اگر ہم امام کو منصوص من اللہ قرار دیں تو ہمارا ربط ہمیشہ خدا سے برقرار رہے گا)

پس امامت (منصوص من اللہ) ہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کو ما ورائے غیب سے متصل کرتی ہے، کیونکہ امامت کے پاس وہ شعور و ادراک اور اطمینان ہوتا ہے جو انسان کو راہ ضلالت سے نکال کر راہ ہدایت پر گامزن کردیتا ہے۔

۲. نص ، اس علم نفس کے قاعدے سے بھی ہم آہنگ ہے جو انسان کے اندر قانون سے سرکشی اور طغیانیت کی روح کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

کیونکہ جب امام خداوند وحدہ لاشریک کی طرف سے بلافصل معین ہوگا تو تمام لوگوں کے نزدیک موثق ، عادل، مخلص اور تمام رذائل و برائی سے پاک و پاکیزہ سمجھا جائے گا اور اس امام کے ذریعہ وہ اسباب جو انسان کے اندر سرکشی اور طغیانیت کے پائے جانے والے اسباب ختم ہوجائیں گے۔

۳. نص ، اس نظریہ سے بھی ہم آہنگ ہے جس کو علماء کرام دین کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اجتماعی زندگی میں روابط کے لئے بہت ضروری چیز ہے جس کی وجہ سے وحدت و اتحاد اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔

لہذا امام منصوص ایک عظیم درجہ کانام ہے جو مبداء اعلیٰ اور ایمان بلند درجہ پر فائز ہوتا ہے۔

لیکن اہل تحقیق اس بات کو جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وفات کے وقت بھی خطرناک اور حساس حالات تھے اور چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمان حالات پر مکمل طریقہ سے علم رکھتے تھے او اپنے بعد ہونے والے واقعات سے بھی باخبر تھے، چنانچہ اپنے بعد ہونے والے واقعات کی خبر بھی دی اور خداوندعالم نے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے: [29]

”اگر (محمد) اپنی موت سے مرجائیں یا مار ڈالے جائیں تو تم الٹے پاؤں (اپنے کفر کی طرف) پلٹ جاؤ گے“ پس کیوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اپنے بعد کے لئے نص اور وضاحت نہیں فرمائی اور کیوں دوسروں نے اس کام کو انجام دیا؟! (معاذ اللہ) کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم دوسروں سے کم درک و فہم رکھتے تھے او ر آپ میں ذمہ داری کا احساس و شعور کم تھا؟!!!

چنانچہ یہ نظریہ نقصان دہ نہیں ہوتا (جبکہ قرآنی آیات او را حدیث نبوی کے ذریعہ اسلامی اصول ثابت کرنے کے بعد اور فطرت انسانی اور علمی دلائل نیز اجماع کے قیام کے بعد) کہ اس کو کوئی چھوڑنے والا چھوڑدے یا اس کو برے القاب سے یاد کرے یا اپنی مرضی سے اس پر کوئی بھی نام منطبق کرے۔

اسی طرح یہ بات بھی امامت کے لئے نقصان دہ نہیں ہے کہ اس پر ”ٹیوقراطی“ ”Theocratic“ کانام دیا جائے

جیسا کہ بعض مولفین نے امامت پر یہ نام منطبق کیا ہے۔

کیونکہ اگر اس سے مراد ”دینی حکومت“ ہو تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے بلکہ صحیح معنی بھی یہی ہیں، اور اگر اس سے دین کے نام پر لوگوں پر حکومت کرنا مراد ہو تو یہ قیاس ہے اور نظریہ امامت کے برخلاف ہے۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر ”مجید خدوری“ نے اس نظریہ کو رد کیا اور امامت پر یہ نام منطبق نہیں کیا کیونکہ یہ واقع پر صادق نہیں ہے بلکہ ایک دوسرا نام ”نوموقرطی“ [30] رکھا یعنی وہ حکومت جس میں قانون کی حکومت اور قانون کو فوقیت حاصل ہو، چنانچہ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس میں شک کرنے والوں اور انکار کرنے والوں کے لئے شک اور انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح امامت کو ”ڈکٹیٹری“ Dictatorship کا نام دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ بعض مولفین نے ایسا کہا بھی ہے۔

کیونکہ ”ڈکٹیٹری“ میں خاص فرد یا خاص افراد کی حکومت ہوتی ہے گویا وہ حکومت کے مالک ہوتے ہیں اور قانون ان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہوتا ہے اور یہ ”ڈکٹیٹری“ واقعاً اسلامی حکومت کے برخلاف ہے کیونکہ اسلامی حکومت میں تو صرف قانون کی حکومت ہوتی ہے اور اس میں قانون کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ قانون کی حکومت جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں (چاہے وہ جنگ کا زمانہ ہو یا غیر جنگ کا) قانونی حکومت کو بروئے کار لائے ہی چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت ”ڈکٹیٹری“ سے بالکل مخالف تھی۔

اسی طریقہ سے امامت پر ”طبقاتی حکومت“ (خاص طبقہ کی حکومت) کا نام دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے اس نظریہ کو پیش کیا ہے۔

کیونکہ کسی خاص طبقہ کی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبقہ تشریعات کو مسخر کر لے اور تمام نظام سے اپنے ذاتی مفاد کو حاصل کرتا رہے، چنانچہ اس طرح کی حکومت سے بھی اسلام کا کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ قانون کی حکومت میکسی کے لئے کوئی نرمی کا خانہ نہیں ہوتا (یہاں تک کہ خود امام کے لئے) یعنی امام کو بھی یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ احکام میں تبدیلی کرے کہ امامت اور طبقہ کے تمام افراد کے درمیان قطع تعلق کرے۔

اسی طرح امامت کو ”غیر ڈیموکریٹک“ کا نام دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ ”ڈیموکریٹک“ میں اہمیت اور بنیاد کسی خاص شعبہ کی حکومت ہوتی ہے اور شعبہ کی حکومت کا مصدر بھی دین ہوتا ہے جو حکومت کی اصل اور بنیاد ہے۔

اور چونکہ خداوند عالم مالک الملک ہے جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے لہذا اس کے لئے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ کائنات کے ہر نظام میں اس کا حکم اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے، یعنی ہر حال میں اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔

اور چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مالک الملک کے نمائندے ہیں اور اسی کی طرف سے بولتے ہیں اور اس کے امین ہیں لہذا ان پر امام کو منصوب اور معین کرنا ضروری ہے اور یہ کام خدا کی مرضی سے ہونا چاہئے، چنانچہ یہی بات سیاسی نظریہ سے بھی ہم آہنگ ہے کہ انتخاب میں مصدر حکومت سے مشورہ ہونا چاہئے۔

امام کے بارے میں وضاحت گذشتہ گفتگو کا خلاصہ :

۱۔ راہ اسلام کو جاری و ساری رکھنے کے لئے امامت کا ہونا ضروری ہے۔
۲۔ امامت کا انتخاب بذات خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر ضروری ہے کیونکہ آپ کی ذات کی مصداق ہے اور جب بات یہاں تک آگئی ہے اور واضح خلاصہ بھی آپ حضرات نے ملاحظہ فرمالیا تو بات آگے بڑھ کر ایک جدید مرحلہ تک پہنچتی ہے اور وہ یہ کہ ہم اس امام کی تلاش کریں جس کے بارے میں نص او راعلان کیا گیا ہے نیز ان واضح نصوص کو بھی ملاحظہ کریں جن کے ذریعہ سے امام کی معرفت و شناخت ہوتی ہے۔

اور چونکہ امامت سے متعلق روایات اور راویوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہیں کہ اس کتاب میں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا اور راویوں کے بیان کرنے کا طریقہ بھی جداجدا ہے، لیکن ہم یہاں پر فقط تین عدد شاہد پیش کرتے ہیں اور باقی تفصیل کو تفصیلی کتابوں کی طرف حوالہ دیتے ہیں۔ (مثلاً الغدير علامہ امینی ، عبقات الانوار اورالمراجعات وغیرہ)

پہلی حدیث: ” حدیث دار “

ابن جریر طبری نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر یہ آیت نازل ہوئی :

[31]

” (اے رسول) تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو (عذاب خدا) سے ڈراؤ“

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے خاندان عبد المطلب کو دعوت کے لئے بلایا جس میں ان کے چچا جناب ابوطالب ، جناب حمزہ، جناب عباس اور ابو لہب بھی تھے اور جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

”یا بنی عبد المطلب انی واللہ ما اعلم شاباً فی العرب جاء قومہ بافضل ممّا قد جئتکم بہ، اُنّی قد جئتکم بخیر الدنیا والآخرۃ، وقد امرنی اللہ تعالیٰ اَنْ اُدعوکم الیہ، فایکم یوازرنی علی هذا الامر علی اَنْ یکون اخي ووصيي وخليفتي فيکم؟“

(اے خاندان عبد المطلب ! خدا کی قسم، میں عرب میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو اپنی قوم میں مجھ سے بہتر پیغام لایا ہو میں تم میں دنیا و آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں ، اور خداوند عالم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس دعوت کو تمہارے سامنے پیش کردوں، پس تم میں کون شخص ہے جو اس کام میں میری مدد کرے، اور جو شخص میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہوگا۔)

چنانچہ یہ سن کر سب لوگوں نے اپنا سر جھکالیا او رکوئی جواب نہ دیا، اس وقت حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہوئے اور کہا:

”انا یا نبی اللہہ اكون وزیرک علیہ ، فقال (ص) ان هذا اخي ووصيي وخليفتي فيکم، فاسمعوا له واطيعوا“

(یا رسول اللہ میں حاضر ہوں اور میں آپ کا وزیر ہوں، تب رسول اللہ نے فرمایا:

یہ میرے بھائی، میرے وصی اور تمہارے درمیان میرے خلیفہ ہیں ان کی باتوں کو سنو اور ان کی اطاعت کرو) یہ سن کر سب لوگ جناب ابو طالب کو یہ کہہ کر ہنستے ہوئے چلے گئے:

”اے ابو طالب تم کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے بیٹے کی باتوں کو سنو اور ان کی اطاعت کرو“ [32]
قارئین کرام ! یہ حدیث اپنے ضمن میں حضرت علی علیہ السلام کے لئے تین صفات کی حامل ہے:

۱۔ وزیر ہونا۔

۲۔ وصی ہونا۔

۳۔ خلیفہ ہونا۔

اب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے حضرت علی علیہ السلام کو کس لئے یہ صفات عطا کئے اور کسی دوسرے کو ان صفات سے کیوں نہیں نوازا؟ اور کیوں آپ نے اس کام کے لئے بعثت کے بعد پہلے جلسہ کا انتخاب کیا؟

اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو اس کام میں اپنے لئے ایک مددگار کی ضرورت تھی تو وزارت کافی تھی لیکن ان کے ساتھ خلافت و وصایت کا کیوں اضافہ کیا؟ اور اپنے رشتہ داروں کو ڈرانے اور ان کو اسلام کی دعوت دینے اور وصایت و خلافت میں کیا ربط ہے؟ ان سوالوں کے جوابات دینے کے لئے ہم پر مندرجہ ذیل چیزوں کا بیان کرنا ضروری ہے:

قارئین کرام ! رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اپنے اس پہلے اعلان میں عہد جدید ، جدید معاشرے اور نئی حکومت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

کیونکہ جب کوئی اہم شخصیت اپنے ہدف کو باقی رکھنا چاہتی ہے تو اس رئیس اور ایک نائب مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اگر رئیس کو کوئی پریشانی لاحق ہو جائے تو اس کے نائب کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بھی اس ہدف کے تحت حاضرین کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ (دین و دنیا) کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو فقط مادام العمر باقی رہے اور اس کے بعد ختم ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک الہی رسالت ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور رسول کی وفات کے بعد ختم نہیں ہوگی، بلکہ جب تک زمین باقی ہے اس وقت تک یہ دین باقی ہے اور رمیرے بعد بھی اس دین کا باقی رکھنے والا ہوگا اور وہ یہ جوان ہے جس نے اس وقت میری مدد و وزارت کا اعلان کیا ہے یعنی حضرت علی بن ابی طالب (علیہ السلام) اور یہ تمام باتیں مذکورہ حدیث شریف میں دقت اور غور و فکر کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ جس کی بنا پر امام رازی نے اس حدیث کی صحت اور سند دلالت کا اعتراف کیا لیکن خلافت کے معنی میں شک کیا اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اپنی وفات کے بعد خلیفہ معین کرنا چاہتے تھے تو ”خلیفۃ فیکم“ نہ کہتے یعنی علی تم میں میرے خلیفہ ہیں، بلکہ ”خلیفۃ فیکم من بعدی“ (یعنی تم میں میرے بعد میرے خلیفہ ہوں گے) کا اضافہ کرتے تاکہ واضح طور پر نص بن جائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں الفاظ میں کوئی فرق نہیں پاتے، اور اگر یہ طے ہو کہ ”خلیفۃ فیکم من بعدی“ دلالت کے اعتبار سے واضح ہوتی تو پھر ”خلیفۃ فیکم“ بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر مجھ پر کوئی پریشانی آجائے تو تمہارے درمیان علی (ع) خلیفہ ہیں اور اسی طرح کے الفاظ موت کے بعد خلافت پر واضح نص ہوتے ہیں اور اس معنی کی تاکید لفظ ”وصی“ کرتا ہے کیونکہ اسلام میں کسی کو موت کے وقت ہی وصی بنایا جاتا ہے کیونکہ موصی کی موت کے بعد وصی اس کے کاموں پر عمل کرتا ہے۔

اور اگر کسی کام کے بارے میں موت سے قبل کہنا ہو تو کہا جاتا ہے ”بذا وکیلی“ (یہ میرا وکیل ہے)، ”وصی“ (میرا وصی) نہیں کہا جاتا کیونکہ وکالت ایک اسلامی تعبیر ہے جو اس شخص کے لئے کہی جاتی ہے جو انسان کی قید حیات میں اس کی نیابت میں کسی کام کو انجام دے۔

لہذا اس بات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے روز اول ہی واضح بیان فرمایا کہ کون میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا اور کون مسلمانوں میں میرا وصی ہوگا تاکہ کشتی اسلام میری وفات کے بعد امواج زمانہ کی نذر نہ ہو جائے۔

اور یہ اسلام کا آغاز جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے اس محدود مجمع میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور ہمیشہ اس پر تاکید فرماتے رہے یہاں تک کہ آخری عمر میں بھی (غدير خم میں) اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔

دوسری حدیث: ”حدیث المنزلۃ“

امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ اس حدیث کو بیان کیا ہے کہ حضرت رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے حضرت علی (علیہ السلام) کے بارے میں فرمایا:

”انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی“ [33]

(اے علی تم میں اور مجھ میں وہی نسبت ہے جو جناب ہارون اور جناب موسیٰ (ع) کے درمیان تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں)

قارئین کرام ! اگرچہ یہ حدیث مختصر ہے لیکن پھر بھی بہت سے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن اگر کوئی طائرانہ نظر ڈالے گا تو اس پر حدیث کے معنی واضح نہیں ہوں گے لیکن اگر کوئی شخص اس حدیث میں غور و فکر کرے گا تو اس پر یہ معنی بہت واضح ہو جائیں گے۔

چنانچہ یہ حدیث شریف حضرت علی علیہ السلام کے لئے اشارہ کرتی ہے :

۱۔ حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ کے وزیر ہیں کیونکہ جناب ہارون جناب موسیٰ کے وزیر تھے:

[34]

”اور میرے کنبہ والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے“

۲۔ آپ رسول اللہ کے بھائی ہیں کیونکہ جناب ہارون جناب موسیٰ کے بھائی تھے:

[35]

”میرے بھائی ہارون“

۳۔ آپ ہی رسول اللہ کے شریک ہیں کیونکہ جناب ہارون بھی موسیٰ کے شریک تھے:

[36]

”اور میرے کام میں اس کو میرا شریک بنا“

۴۔ حضرت علی علیہ السلام خلیفہ رسول ہیں ، جیسا کہ جناب ہارون جناب موسیٰ کے خلیفہ تھے:

[37]

”(اورچلتے وقت) موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے جانشین ہو“

۵۔ امامت نبوت سے مشتق ہے کیونکہ حدیث میں ضمیر ”انت“ امامت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور لفظ ”مئی“

نبوت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہاں پر حرف ”جر“ نشو و نمو اور وجود کے معنی میں ہے اور یہ نشو و نما اس

بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ دونوں درجہ میں برابر ہیں تب ہی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و

سلمنے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

”الا انه لا نبی بعدی“ (مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں)

اور جب جناب موسیٰ (ع) نے خدوند عالم سے درخواست کی کہ ان کے اہل سے ان کا وزیر معین کردے (جیسا کہ مذکورہ آیت بیان کرتی ہے) تو یہ درخواست جناب موسیٰ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ نبی کی خلافت و وزارت خدا کے حکم سے ہوتی ہے لوگوں کے انتخاب اور اختیار سے نہیں۔

قارئین کرام! جب ہم ”حدیث منزلت“ کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں تو یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے یہ سب کچھ فقط حضرت علی علیہ السلام کے اکرام اور تجلیل کی غرض سے نہیں بیان کیا بلکہ اس کے پس پردہ ایک بہت اہم مقصد تھا اور وہ یہ کہ آپ امت کو اس بات پر متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ نبی اپنے بعد حکومت کی ریاست اور کشتی اسلام کی مہار کس کے ہاتھ میں دے کر جارہے ہیں۔

اور جیسا کہ یہ حدیث شریفہ اشارہ کرتی ہے کہ حضرت علی (ع)، نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ شریک ہیں لیکن یہ شرکت کسی تجارت، صنعت او رزراعت میں نہیں ہے بلکہ آپ کی شرکت دین اور اسلام میں ہے اور اسلام میں پیش آنے والی تمام زحمتوں کو برداشت کیا اور دین کی اہم ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی، اور چونکہ ایک معمولی انسان شرکت کے حدود کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا (خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ جناب ہارون نبی بھی تھے) اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے حدیث منزلت میں ایسی قید لگادی تاکہ اشکال نہ ہونے پائے اور اس شرکت کی حدود بھی معین کردی اسی وجہ سے مطلق طور پر نبوت کی نفی کردی اور نبوت کو شرکت کے حدود سے نکالتے ہوئے فرمایا:

” میرے بعد کوئی نبی نہیں ”

اور شاید اس حدیث کے معنی اس وقت مزید روشن ہوجائیں جب یہ معلوم ہو کہ حدیث منزلت کو رسول اسلام نے اس وقت بیان فرمایا جب آپ مدینہ منورہ سے ”جنگ تبوک“ میں جارہے تھے اس وقت نائب اور قائم مقام بنایا ۔

لیکن شیخ ابن تیمیہ اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس حدیث سے حضرت علی علیہ السلام کی کوئی بھی فضیلت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ جس وقت رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم جنگ تبوک کے لئے نکلے ہیں تو آپ کے ساتھ تمام اصحاب اور تمام مومنین تھے او رمدینہ میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا یا وہ لوگ جو جنگ میں نہیں گئے تھے چاہے وہ مجبور ہوں یا منافق تو ایسے لوگوں پر کسی کو خلیفہ بنانا کوئی بھی فضیلت نہیں رکھتا۔ [38]

لیکن حدیث پر غور و فکر کرنے والا شخص ابن تیمیہ کے نتیجہ سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرا نتیجہ نکالتا ہے کہ:

اس وقت مدینہ منورہ مرکز نبوت اور دار السلطنت تھا۔

جب کسی حکومت کا رئیس اپنے دار السلطنت سے کسی دوسری جگہ جاتا ہے (جیسے تبوک) اور چونکہ اس وقت کا مواصلاتی نظام بہت ہی کمزور ہوتا تھا تو گویا جانے والا ایک طویل مدت کے لئے وہاں سے غائب ہورہا تھا اور چونکہ جنگ کے مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کب ختم ہوگی اور کب پلٹ کر آنا ہوگا تو ایسے موقع پر کسی رئیس کا نائب بنانا اور اس کو دار السلطنت میں جانشین بناکر چھوڑنا ایک عظیم معنی رکھتا ہے اور وہ بھی ایسے ماحول میں جب دشمنان اسلام اور منافقین کی طرف سے ہر ممکن خطرہ موجود ہو اور وہ ایک ایسی فرصت کی تلاش میں ہوں کہ موقع ملنے پر اسلام اور مسلمانوں کو نابود کر ڈالیں، لہذا ایسے ماحول میں حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ معین کرنا ایک عظیم فضیلت ہے۔

تیسری حدیث: ”حدیث غدیر“

اس حدیث کو اکثر صحابہ و تابعین نے روایت کیا ہے اور بہت سے علماء و حفاظ نے اس کو نقل کیا ہے۔ [39] بطور اختصار ہم صرف حدیث کے محل شاہد اور ان چیزوں کو بیان کرتے ہیں جو امامت و امام کی وضاحت سے متعلق ہیں۔

چنانچہ اکثر روای کہتے ہیں:

”جب ہم حجة الوداع سے واپس پلٹ رہے تھے ، اور غدیر خم میں پہونچے تو رسول اسلام نے نماز ظہر کے بعد مسلمانوں کے درمیان خطبہ دیا اور حمد باری تعالیٰ کے بعد فرمایا:

”اے لوگو ! قریب ہے کہ میں اپنے پروردگار کی دعوت پر لبیک کہوں میں بھی مسئل ہوں او ر تم بھی مسئل ہوں، پس تم لوگ کیا کہتے ہو؟

تب لوگوں نے کہا: ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے دین اسلام کی تبلیغ کی، ہم کو وعظ و نصیحت کی اور جہاد کیا ، ”فجزاک اللہ خیراً“

یہاں تک کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا:

”ان اللہ مولای وانا مولی المؤمنین ، وانا اولی بہم من انفسہم، فمن کنت مولاه فهذا علی مولاه، اللہم وال من والاه وعاد من عاداه وانصر من نصرہ، واخذل من خذله واؤدر الحق معه حیثما دار۔“

(اللہ میرا مولا ہے او رمیں مومنین کا مولا ہوں اور میں ان کے نفسوں پر اولیٰ بالتصرف ہوں پس جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علی بھی مولا ہیں، خدایا تو اس کو دوست رکھ جو علی کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علی کو دشمن رکھے، خدا یا تو اس کی نصرت فرما جو علی کی نصرت کرے، اور اس کو ذلیل کردے جو علی کو ذلیل کرنا چاہے او ر جدھر علی جائیں حق کو ان کے ساتھ موڑدے)

اور جب رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا یہ کلام تمام ہوا تو سب لوگ حضرت علی علیہ السلام کی طرف مبارکباد دینے کے لئے بڑھے، چنانچہ حضرت عمر نے کہا:

”بخ بخ لک یا علی، اصبحت مولانا ومولی کل مومن ومومنة“

(مبارک ہو مبارک اے علی، آپ ہمارے اور ہر مومن ومومنه کے مولا ہو گئے)

اس کے بعد جناب جبرئیل یہ آیت لے کر نازل ہوئے:

[40]

”آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمہارے اس دین اسلام کو پسند کیا“

قارئین کرام ! یہ تھا حدیث غدیر کا خلاصہ، اور یہ تھی شان نزول اور یہ تھے الفاظ حدیث، اس حدیث شریف میں نظریہ ”امامت“ کی مکمل وضاحت کی گئی ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ امامت ، ولایت عام او ر مطلقہ مسئولیت کی حامل ہے اور سول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وفات کے بعد جس امام کے بارے میں سوال کیا جا رہا تھا اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور اس حدیث و دلیل کو سن کر لوگوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا جس کے نتیجہ میں تہنیت اور مبارکباد پیش کرنے لگے۔

لیکن بعض لوگوں نے فلسفہ چھاڑنا شروع کیا درحالیکہ وہ حدیث کی صحت کا انکار نہ کرسکے بلکہ یہ کہا کہ یہ حدیث آپ کے مدعا کو ثابت نہیں کرتی چونکہ لغت میں لفظ ”مولا“ کے بہت سے معنی ہیں جیسے ناصر، ابن

عم، رفیق، وراث وغیرہ اور ہم یہ نہیں جانتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی مراد کون سے معنی تھے اور کس معنی میں حضرت علی علیہ السلام کو مولا کہا ہے۔

لیکن یہ فلسفہ تراشی خود غرضی اور ہوا و ہوس کی دین ہے اور نہ ہی معترض نے موضوع میں غور و فکر کیا ہے۔ ان اعتراضات کو ختم کرنے کے لئے درج ذیل امور رپر توجہ کرنا:

۱۔ اعلان ولایت سے قبل آیہ بلّغ کا نازل ہونا چنانچہ مورخین و مفسرین نے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم آخری حج سے واپس آرہے تھے تو اس وقت خداوند عالم نے وحی فرمائی:

[41]

”اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہونچادو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو) تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہونچایا اور (تم ڈرو نہیں) خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا“

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا اعلان ولایت کے لئے جنگل میں ظہر کے وقت کا انتخاب کرنا۔

۳۔ کلام پیغمبر میں تینوں ولایت کا ذکر ہونا:

الف: اللہ مولای۔

اللہ میرا مولا ہے۔

ب: انا مولی المومنین۔

میں مومنین کا مولا ہوں۔

ج: من كنت مولا فہذا علی مولاہ۔ [42]

جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علی (ع) بھی مولا ہیں۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا حضرت علی علیہ السلام کے لئے دعا کرنا:

”اللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهِ وَعَادَ مَنْ عَادَاهِ وَاخْذَلْ مَنْ خَذَلَهُ وَادْرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ۔ [43]

پروردگارا ! تو اسے دوست رکھ جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علی کو دشمن رکھے اور ذلیل کر اس کو جو علی کو ذلیل کرنا چاہے، اور حق کو ادھر موڑ دے جدھر علی جائیں ۔

جبکہ اس دعا میں ولایت کے معنی بغیر حاکم کے مکمل نہیں ہوسکتے ہیں

۵۔ آیہ اکمال کا نازل ہونا: **اليوم اكملت لكم دينكم** --- [44] جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ

تھا جس وجہ سے خداوند عالم نے دین کو کامل کیا اور نعمتیں تمام کیں۔

۶۔ حاضرین غدیر خم کا حضرت علی علیہ السلام کا مذکورہ الفاظ میں مبارک باد پیش کرنا۔ [45]

مذکورہ چھ نکات میں غور و فکر کرنے سے انسان کو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کی نظر میں حضرت علی

(ع) رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے وراث، ناصر، دوست او رابن عم نہیں ہیں اور نہ ہی ارث و نصرت کا

مسئلہ ہے اور اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم ان باتوں کا قصد کرتے تو پھر غدیر کے ماحول اور ان آیات

جن کو خدا نے اس موقع پر نازل فرمایا اور تبریک و تهنیت کے لئے ایسے الفاظ کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اگر لفظ

مولا سے مراد امامت و خلافت نہ ہو تو پھر ان سب چیزوں کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اور جیسا کہ ڈاکٹر احمد محمود صبحی نے حقیقت کا انکشاف کیا ہے اور جو لوگ اس حدیث کا انکار کرتے ہیں

ان کے لئے بہترین جواب دیا ہے، چنانچہ موصوف کہتے ہیں:

”چونکہ اہل ظاہر (حنبلیوں) اور سلفیوں (وہابیوں) کے نزدیک معاویہ سے محبت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں

تھا لہذا اس سے محبت کرنا ہی اپنا شعار بنارکھا ، اسی وجہ سے انہوں نے مذکورہ حدیث کے معنی اس لحاظ سے کئے تاکہ علی کی محبت کو ترک کرنے میں کوئی مضائقہ پیش نہ آئے۔ [46]

مذکورہ باتوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اپنی امت کی قیادت ورہبری کے لئے امام کی معرفی کی ہے۔

اور مذکورہ حدیث (اگرچہ اس کے الفاظ او رمناسبت مختلف ہیں) امامت کے بارے میں صاف اور روشن ہے جو مکمل طریقہ سے ہمارے مقصود پر دلالت کرتی ہے۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فقط امام اول کا معین ہوجانا کافی ہے اور باقی ائمہ علیہم السلام کے بارے میں تعین کی ضرورت نہیں ہے یا ان کے لئے بھی نص اور احادیث کا ہونا ضروری ہے؟

یعنی باقی ائمہ (ع) کی امامت کیسے ثابت ہوگی؟ اور ان کو بارہ کے عدد میں محدود کرنا (نہ کم وزیاد) کیسے صحیح ہے؟

قارئین کرام ! ائمہ (ع) کی امامت کو دو طریقوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے:

پہلا طریقہ:

ان احادیث کے ذریعہ جن کی تعداد بہت زیادہ اور بہت مشہور ہیں جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو مخاطب کرکے فرمایا:

”انتم الامامان ولامکما الشفاعة“ [47]

(تم دونوں امام ہو اور دونوں شفاعت کرنے والے ہو)

اسی طرح امام حسین علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

”ہذا امام ، ابن امام اخو امام، ابو الائمة“ [48]

(یہ خود بھی امام ہیں اور امام کے بیٹے ، امام کے بھائی او رنو اماموں کے باپ ہیں)

اور اس طرح بہت سی روایات موجود ہیں جن سے کتب حدیث وتاریخ بھری پڑی ہیں اور ان میں امامت کی بحث تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

دوسرا طریقہ:

گذشتہ امام کے ذریعہ آنے والے امام کا بیان، اورچونکہ گذشتہ امام کا بیان، حجت اور دلیل ہوتاہے اور اس پر یقین رکھناضروری ہے جبکہ ہم گذشتہ امام کی امامت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو صادق اور امین جانتے ہیں۔[49]

اب رہا ائمہ (ع) کا بارہ ہونا نہ کم نہ زیادہ تو اس سلسلہ میں بھی بہت سی روایات موجود ہیں[50] اور ہمارے لئے بھی کافی ہے کہ اس مشہور ومعروف حدیث نبوی کو مشہور ومعروف شیوخ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ارشاد فرمایا: ”لايزال الدين قائما حتى تقوم الساعة ويكون اثنا عشر خليفة كلهم من قریش“ [51]

(دین اسلام قیامت تک باقی رہے گا او رتمہارے بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے)

ایک دوسری حدیث میں اس طرح ہے:

”ان بذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیہ اثنا عشر“ [52]

(بتحقیق یہ امر (دین) ختم نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس میں بارہ (خلیفہ) ہوں گے) اور اگر ہم اس حدیث شریف میں غور و فکر کریں (جبکہ اس حدیث کو تمام مسلمانوں نے صحیح مانا ہے) تو یہ حدیث دو چیزوں کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہے:

۱۔ دین کا قیامت تک باقی رہنا۔

۲۔ قیامت تک فقط بارہ خلیفہ ہی ہوں گے جو اسلام و مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار ہوں گے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا بارہ خلیفہ سے وہ حکام مراد نہیں ہیں جو شروع کی چار صدیوں میں ہوئے ہیں کیونکہ ان کی تعداد بارہ کے کئی برابر ہے اور ان میں سے اکثر کتاب و سنت رسول کے تابع نہیں تھے لہذا وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے حقیقی خلیفہ نہیں ہوسکتے۔ تو پھر ان کے علاوہ ہونے چاہئیں، اور وہ حضرت علی (ع) اور ان کے گیارہ فرزندوں کے علاوہ کوئی نہیں، یہ وہ ائمہ ہیں جن سے لوگ محبت کیا کرتے تھے اور ان کا اکرام کیا کرتے تھے اور انہیں سے اپنے دینی احکام حاصل کیا کرتے تھے، نیز اپنی فقہی مشکلات میں انہیں کی طرف رجوع کرتے تھے اور جب بھی کوئی مشکل پڑتی تھی اس کے حل کے لئے انہیں ائمہ (ع) کے پاس جایا کرتے تھے۔

اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں احادیث نبوی اور ان کے عدد کے بارے میں مزید اطلاع حاصل کرنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ مخصوص مفصل کتابوں کا مطالعہ کرے۔ (مثلاً الغدیر علامہ امینی رحمۃ اللہ علیہ، عبقات الانوار سید حامد حسین طاب ثراہ وغیرہ)

حضرات ائمہ علیہم السلام

سلسلہ بحث کو مکمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر ائمہ (ع) کے اسماء گرامی اور ان کے زمانہ کے مختصر حالات بیان کریں نیز مختصر طور پر ان کی چھوڑی ہوئی میراث کے بارے میں بھی ذکر کریں اور خود ان حضرات کی مختصر طور پر سوانح حیات بیان کریں، ان تمام باتوں میں ہم اختصار کا پورا خیال رکھےں گے تاکہ ہماری کتاب بہت زیادہ ضخیم نہ ہو جائے۔

اور ہماری ساری امید خداوند عالم کی ذات پر ہے کیونکہ وہی مدد کرنے والا ہے تاکہ ہم ائمہ (ع) کی سوانح حیات کو تحریر کرسکیں اور ہر امام کے حالات بیان کریں تاکہ آج کا ہمارا زمانہ ان کی رہبری و قیادت اور ان کی چھوڑی ہوئی میراث کو پہچان لے، چنانچہ انہوں نے زمانہ کے لئے ایسی ایسی میراث چھوڑی ہیں جو عالم بشریت کے لئے بہت عظیم سرمایہ اور مایہ سرفرازی و باعث عزت ہے۔ خداوند عالم ہماری مدد و نصرت فرمائے (آمین)

پہلے امام : حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام

حضرت علی (ع) کا مشہور لقب ”امیر المومنین“ ہے آپ کو اس لقب سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے سرفراز فرمایا تھا۔ [53]

آپ کی ولادت باسعادت مکہ معظمہ اور خانہ کعبہ میں ۱۳/رجب المرجب ۳۰ عام الفیل کو ہوئی۔ [54] آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے بچپن ہی سے اپنے پاس رکھا تاکہ آپ کے چچا ابوطالب پر کچھ بوجھ کم ہو جائے، چنانچہ خداوند عالم نے یہ چاہا کہ آپ کی تربیت اس کا محبوب رسول کرے اور ہر طرح کی مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مبعوث بہ رسالت ہوئے تو سب

سے پہلے حضرت علی علیہ السلام نے اظہار اسلام کیا۔[55]

اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے اپنے قبیلہ والوں کو اسلام کی دعوت دی تو اسی موقع پر آپ کی وزارت ، وصایت اور خلافت کے بارے میں واضح بیان دیا (جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے) اور جس وقت رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو حضرت علی علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمکی شبیہ بن کر آپ کے بستر پر سو رہے تاکہ قریش یہ سمجھیں کہ ”محمد“ (ص) ابھی بستر پر سو رہے ہیں۔

اور مدینہ منورہ ہجرت کے بعد آپ نے تمام اسلامی جنگوں میں شرکت کی اور ہر جنگ میں پرچم اسلام آپ (ع) ہی کے ہاتھوں میں رہا، اور آپ (ع) ہر جنگ میں (سوائے جنگ تبوک کے) نبی کے ساتھ ساتھ رہے ، چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے آپ کو اسلام کی دار السلطنت میں احتمالی خطرے کی بنا پر مدینہ میں چھوڑ دیا تھا (جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے)

خداوند عالم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے آپ کی تکریم کی خاطر رسول اللہ کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے شادی کی۔[56]

اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمنے اپنی آخری عمر میں آپ کو امامت کے لئے منصوب کیا جیسا کہ حدیث غدیر میں گزر چکا ہے۔

اور چونکہ وفات نبی کے بعد آپ کی زندگی میں بہت سے حادثات رونما ہوئے لیکن آپ (ع) نے اپنی کوشش اور وعظ و نصیحت کو جاری رکھا تاکہ ہدف اسلام آگے بڑھتا رہے اور اس مقدس راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہے، اور مشکل حالات کو برداشت کرتے رہے۔ اور جب لوگوں نے قتل عثمان کے بعد آپ کو خلافت قبول کرنا چاہا تو چنانچہ آپ نے کراہۃ قبول کر لی لیکن اسی مناسبت سے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

”اگر حاضرین کی بھیڑ جمع ہو کر میرے پاس نہ آتی او رہ یہ ثابت ہوجاتا کہ ہمارے ناصر و مددگار موجود ہیں او راگر علماء سے خدا کا عہد و پیمان نہ ہوتا کہ ظالم سے دشمنی اور مظلوم سے ہمدردی کریں تو پھر میں اس خلافت کی مہار کو اس کے سوار پر ڈال دیتا اور اس کے دوسرے کو پہلے والے کے کاسہ سے سیراب کردیتا، کیونکہ میں نے اس دنیا کو بکری کے ناک سے بہتے گندے پانی سے بھی پست پایا۔“ (خطبہ شفشقیہ)

آپ کی خلافت کے دوران ناکثین (اہل جمل) قاسطین (تابع معاویہ) اور مارقین (خوارج) سے جنگ ہوئی۔[57]

آپ کی شہادت، مظلومانہ طریقہ سے شب ۲۱ / رمضان المبارک ۴۰ھ [58] کو کوفہ میں ہوئی اور آپ کو کوفہ سے باہر ”نجف“ میں دفن کر دیا گیا۔

دوسرے امام : حضرت حسن بن علی علیہ السلام

آپ کے دو مشہور و معروف لقب ”مجتبیٰ“ او ر ”زکی“ تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت شب ۱۵ / رمضان المبارک تین ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

آپ کی تربیت آغوش پیغمبر اور قرآنی ماحول میں ہوئی۔

آپ امام ہدیٰ [59] وسیدی شباب اہل الجنة [60] میں سے ایک ہیں آپ کی ذات ان دومیں سے ایک ہے جن کے ذریعہ ذریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمباقی ہے، آپ ہی ان چار حضرات میں سے ایک ہیں جن کے ذریعہ رسول اسلام نے نصاریٰ نجران سے مباہلہ کیا او رآپ ہی پنجتن پاک کی ایک فرد ہیں جن کی شان میں آیہ تطہیر نازل ہوئی۔

آپ نے رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ سات سال زندگی گذاری اور اس کے بعد اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ تمام مشکلات و مصائب میں شریک رہے اور جب حضرت علی علیہ السلام کی وفات ہوئی تو خلافت آپ کے قدموں میں آگئی اور معاویہ اور شام کے رہنے والوں کے علاوہ پورے عالم اسلام نے آپ کی بیعت کی، آپ نے دین کی خاطر اپنے لشکر کو معاویہ اور اس کے لشکر سے مقابلہ کے لئے بھیجا لیکن اس کے بعد آپ کو مشہور و معروف صلح کرنی پڑی آپ کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پہلے ہی ارشاد فرمادیا تھا:

”ان بذّا سید یصلح اللہ علی یدیه بین فئتين عظیمتين“ [61]

(یہ میرا بیٹا سید و سردار ہے خداوند عالم اس کے ہاتھوں پر دو عظیم گروہ کی صلح کرائے گا) قارئین کرام! صلح امام حسن علیہ السلام کی تفصیل یعنی اس موقع کے حالات کیا تھے امام علیہ السلام نے کس طرح ان حالات کا مقابلہ کیا، صلح کا مقصد کیا تھا، اس صلح کے کیا کیا بند تھے، شرطیں کیا کیا تھیں، کیا معاویہ نے ان شرائط کو پورا کیا؟ ان تمام چیزوں کو اس کتاب کی ضخامت کے پیش نظر بیان نہیں کیا جاسکتا اور جو شخص ان تمام چیزوں کی تفصیل جاننا چاہے تو وہ ”صلح الحسن“ نامی کتاب کا مطالعہ کرے، کیونکہ مذکورہ کتاب میں مکمل طریقہ سے بحث کی گئی ہے اور اس کتاب کے متعدد ایڈیشن بھی چھپ چکے ہیں۔ بعض معترضین نے امام حسن علیہ السلام پر یہ بھی اعتراض کیا کہ آپ کی کئی بیویاں تھیں یہاں تک کہ بعض لوگوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کی بیویوں کی تعداد ۳۰۰ سے ۹۰۰ کے درمیان تھی۔ [62] لیکن تاریخ کی تحقیق سے یہ اعتراض بے جا ثابت ہوتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کی سات یا آٹھ بیویاں تھیں۔ [63] جیسا کہ یہ بات بھی کشف ہوجاتی ہے کہ آپ (ع) اپنے اپنی تین بیویوں کو طلاق بھی دی ہے۔ [64]

چنانچہ ڈاکٹر احمد محمود صبحی صاحب نے آپ کے مسئلہ تعدد ازواج کے بارے میں حاشیہ لگایا اور کہا: ”آپ کا تعدد ازواج سے شاید مقصد یہ رہا ہو کہ مختلف قبائل سے آپ کے سسرالی رشتہ داری ہوجائے کیونکہ (ابن خلدون کے قول کے مطابق) حاکم وقت اپنی رشتہ داری اور خاندان کے بل بوتہ پر حکومت کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ تمام بنی امیہ نے اس کی حکومت کی طرف داری کی، (اور اس کی حمایت میں حکومت شام کے مخالفین کا قتل و غارت کیا)

چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ آپ کی اولاد کو قتل کیا جا رہا ہے اور آپ کی نسل کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے کثرت ازواج اور کثرت نسل کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں دیکھا۔ [65] آپ کو (معاویہ کے حکم سے) زہر دیا گیا اور آپ مدینہ منورہ میں ۲۸ / صفر سن پچاس ہجری [66] کو شہید کئے گئے اور آپ کو جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا۔

تیسرے امام : حضرت حسین بن علی علیہ السلام

آپ کا مشہور و معروف لقب ”سید الشہداء“ ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۳ / شعبان المعظم سن چار ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

آپ کی پرورش سایہ نبوت، موضع رسالت، مختلف الملائکہ اور معدن علم میں ہوئی۔

آپ بھی اپنے بھائی امام حسن علیہ السلام کے تمام بنیادی فضائل میں شریک ہیں یعنی آپ بھی امام ہدیٰ، سیدا شباب اہل الجنة میں سے ایک ہیں، آپ ہی کی ذات ان دو میں سے ایک ہے جن کے ذریعہ ذریت رسول

باقی ہے آپ ہی ان چار حضرات میں سے ایک ہیں جن کے ذریعہ رسول اسلام نے نصاریٰ نجران سے مباہلہ کیا اور آپ بھی پنچتن پاک (ع) کی ایک فرد ہیں جن کی شان میں آیہ تطہیر نازل ہوئی۔

آپ (ع) نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ چھ سال تک کی زندگی گزاری، او رآپ پر وہ تمام مصیبتیں پڑیں جو وفات رسول کے بعد اہل بیت (ع) پر پڑیں یہاں تک کہ آپ کے بھائی امام حسن علیہ السلام کو زہر سے شہید کر دیا گیا او رآپ نے اپنی زندگی میں اپنی والدہ گرامی، پدر بزرگوار اور اپنے بھائی کے غم کو برداشت کیا۔

اور جس وقت معاویہ کی موت ہوئی تو یزید اس کا وارث بنا اور اس نے سب مسلمانوں کو اپنی بیعت کے لئے بلایا، تو ان میں سے بعض لوگوں نے نالائق جوان کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔

چنانچہ آپ کی حکومت وقت سے مخالفت کے تین اہم اسباب تھے:

۱۔ یزید کا مستحق خلافت نہ ہونا اور خلافت کی اہلیت نہ رکھنا۔

۲۔ صلح امام حسن علیہ السلام میں جو معاہدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا کیونکہ معاویہ کے ساتھ یہ طے ہوا تھا کہ معاویہ کے بعد خلافت آپ (امام حسن ع) ہی کے پاس رہے گی او راگر امام حسن (ع) کے لئے کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آگیا تو ان کے بعد حق خلافت ان کے بھائی امام حسین علیہ السلام کو ہوگا، لہذا معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ معین کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ [67]

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاویہ کے مرتے ہی امام حسین علیہ السلام در حقیقت صاحب خلافت ہو گئے تھے کیونکہ معاویہ نے اس معاہدہ پر بھی دستخط کر رکھے تھے۔

۳۔ اس وقت کے حالات اس طرح کے تھے کہ ایسے حالات میں قیام کرنا واجب ہوجاتا ہے کیونکہ خود آپ (ع) نے ایک حدیث میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

”انی لم اخرج بطراً ولا شرّاً ولا مفسداً ولا ظالماً وانما خرجت اطلب الصلاح فی امة جدی محمد (ص) ارید ان آمر بالمعروف وانہی عن المنکر“ [68]

(میں کسی فتنہ و فساد اور ظلم کے لئے نہیں نکل رہا ہوں بلکہ میں اپنے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی امت کی اصلاح کے لئے نکل رہا ہوں اور میں امر بالمعروف او رنہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں) اسی طرح اپنے شیعوں کے نام ایک خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

”فلعمری ما الامام الا الحاکم بالکتاب، القائم بالقسط، الدائن بدین الحق، الحابس نفسه علی ذات اللہ“ [69]

(خدا کی قسم امام کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ قرآن کے مطابق حکم کرے، عدالت قائم کرے، دین حق کی طرف دعوت دے اور پروردگار کے سامنے اپنے نفس کا حساب کرے)

قارئین کرام ! اس اسباب کی تحقیق و بررسی کے بعد ان لوگوں کا نظریہ باطل ہوجاتا ہے جن کی نظر میں امام حسین علیہ السلام خطاکار ہیں جیسے ابوبکر بن عربی وغیرہ، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ امام حسین کے لئے یزید کی بیعت کر کے خاموش ہوجانا بہتر تھا۔ [70]

قارئین کرام ! آپ حضرات غور تو کریں کہ کیسے امام حسین علیہ السلام کے لئے یہ بہتر تھا کہ یزید کی بیعت کر کے خاموش ہوجاتے جبکہ امام حسین علیہ السلام اپنے اوپر واجب دیکھ رہے تھے کہ قیام کریں اور خود معاویہ نے اس عہد نامہ پر دستخط کر رکھے تھے جس میں امام حسین علیہ السلام کو بیعت نہ کرنے اور سکوت اختیار نہ کرنے کا حق تھا۔

لہذا حضرت امام حسین علیہ السلام تاریخ کے اوراق پر فاتح اکبر کے نام سے مشہور ہیں اگرچہ کربلا کے میدان

میں ظاہری طور پر آپ کو اور آپ کے لشکر کو تہ تیغ کردیا گیا جبکہ ان کے قاتلوں پر ہمیشہ تاریخ لعنت کرتی چلی آرہی ہے، اگرچہ انہوں نے اپنی جنگ میں غلبہ حاصل کیا، بلکہ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ جس میں جنگ میں (ظاہری) غلبہ پانے والوں پر دنیا نے اس طرح لعنت و ملامت کی ہو جس طرح قاتلین امام حسین علیہ السلام پر کی ہے [71]

آپ کی شہادت ۱۰/ محرم ۶۱ھ کو عصر کے وقت کربلا میں ہوئی [72] اور آپ کربلائے معلیٰ میں دفن ہیں۔

چھوٹے امام: حضرت زین العابدین علیہ السلام

آپ کے دو مشہور لقب ہیں ”سجاد“ اور ”زین العابدین“، آپ کی ولادت باسعادت مدینہ منورہ میں سن اڑتیس ہجری کو ہوئی، آپ کا اس وقت بچپن تھا جس وقت آپ کے جد امیر المومنین علیہ السلام پر مصائب پڑے اور آپ کے چچا امام حسن علیہ السلام کے ساتھ سازش کی گئی جس کے بعد آپ کو معاویہ سے صلح کرنا پڑی، (جیسا کہ اشارہ گذر چکا ہے)

اور جس وقت واقعہ کربلا نمودار ہوا اس وقت آپ کی جوانی کا عالم تھا آپ تمام مصائب کربلا میں شریک تھے یہاں تک کہ آپ کو اسیر کر کے شام لے جایا گیا لیکن آپ اور آپ کی پھوپھی جناب زینب سلام اللہ علیہا نے یزید کے مقصد کو ناکام بنادیا کیونکہ یزید لوگوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایک خارجی نے حکومت وقت پر خروج کیا تھا لہذا اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا گیا (لیکن جناب سید سجاد اور جناب زینب (سلام اللہ علیہما) کے خطبوں کی وجہ سے یزید کا سارا ہدف کافور ہو گیا، چنانچہ امام علیہ السلام کی زندگی میں واقعہ کربلا کے بعد جب مدینہ والوں نے یزیدی ظلم و جور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ”واقعہ حرہ“ پیش آیا جس میں یزید نے اپنی فوج کے لئے اہل مدینہ کے مال و دولت اور ناموس کو حلال کردیا تھا اور انہوں نے ظلم و بربریت کا وہ دردناک کھیل کھیلا کہ تاریخ شرمندہ ہے، اس واقعہ میں مروان بن حکم جیسے آپ کے دشمن کو بھی سوائے آپ کے در دولت کے علاوہ کھیں پناہ نہ ملی۔ [73]

اور ان لوگوں کو اس وجہ سے امام علیہ السلام نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی تاکہ تاریخ اور لوگوں کے لئے ایک عظیم درس مل جائے کہ الٰہی امام کا کردار کیسا ہوتا ہے۔ امام علیہ السلام نے حکومت وقت کے ظلم اور اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت کو اپنی دعاؤں میں بیان کرنا شروع کیا اور یہ دعائیں لوگوں کو تعلیم دینا شروع کیں، چنانچہ امام علیہ السلام کی یہ دعائیں مومنین میں رائج ہوتی چلیں گئیں ان دعاؤں میں حاکم وقت کی حقیقت اور اس کے ظلم و جور کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور لوگوں کے ذہن کو ان سازشوں کی طرف متوجہ کیا کہ حکومت وقت تعلیمات دین کو ختم کرنا چاہتی ہے اور مقام اولیاء اللہ واصفیاء اللہ پر قبضہ کرنا چاہتی ہے نیز حلال و حرام میں تحریف کرنا چاہتی ہے اور سنت رسول کو نابود کرنا چاہتی ہے۔ [74]

چنانچہ امام علیہ السلام نے ان سخت حالات کا مقابلہ اپنی دعاؤں کے ذریعہ کیا، امام (ع) کی ان دعاؤں کے مجموعہ کو ”صحیفہ سجادیہ“ کہا جاتا ہے امام کی یہ عظیم میراث ہمارے بلکہ ہر زمانہ کے لئے حقیقت کو واضح کردیتی ہے، یہ عظیم کتاب مختلف تراجم کے ساتھ سیکڑوں بار چھپ چکی ہے۔

امام علیہ السلام کی عظیم میراث میں سے ”حقوق“ نامی رسالہ بھی ہے جس میں تمام خاص و عام حقوق بیان کئے گئے ہیں جس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ عوام الناس کے حقوق کیا ہیں اور خدا کے حقوق کیا ہیں انسان کو اپنے اعضاء و جوارح پر کیا حق ہے اور کیا حق نہیں ہے، چنانچہ یہ رسالہ بھی متعدد بار طبع ہوچکا ہے۔ امام سجاد علیہ السلام کی شہادت ۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی اور آپ کو ”جنت البقیع“

پانچویں امام : حضرت محمد باقر علیہ السلام

آپ کا مشہور و معروف لقب ”الباقر“ ہے اور آپ کو یہ لقب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے عطا فرمایا تھا۔ واقعہ کربلا میں آپ کا عہد طفولیت تھا اور اپنی جوانی میں ان تمام مشکلات و مصائب میں شریک تھے جو آپ کے پدر بزرگوار امام سجاد علیہ السلام اور دوسرے علویوں پر پڑے۔ جب آپ اپنے پدر بزرگوار کی وفات کے بعد منصب امامت پر فائز ہوئے تو آپ حکومت وقت سے بالکل جدا ہو گئے اور کسی بھی طرح کا کوئی رابطہ نہ رکھا چنانچہ آپ نے اپنا سارا وقت علوم دینی اور حقائق اسلام کو بیان کرنے میں صرف کر دیا اور گذشتہ اموی حکومت کے زمانہ میں فقہ و حدیث جو اموی دور میں بغبار آلود ہو گئے تھے ان کو صاف کر دیا۔

در حالیہ آپ کا حکام زمانہ سے بالکل رابطہ نہیں تھا لیکن جب بھی انہیں کوئی مشکل اور پریشانی ہوتی تھی تو ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور امام علیہ السلام بھی اس سلسلہ میں ذرہ برابر بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی مشکلات کو حل فرما دیا کر دیتے تھے اور ان کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے، اسلام اور ارکان اسلامی کی حفاظت فرماتے تھے۔

جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عبد الملک بن مروان کا امام علیہ السلام سے مشورہ کے بعد ان تمام ظروف اور رکپڑوں کو بند کر دیا جن پر مصر کے بعض عیسائیوں نے سریانی زبان میں اپنا عقیدہ ”اب، ابن اور روح القدس“ چھاپ کر بازاروں میں روانہ کیا تھا۔

اسی طریقہ سے جب خلیفہ اور بادشاہ روم کے درمیان گفتگو ہوئی اور خلیفہ بادشاہ روم کو کوئی مستحکم جواب نہ دے سکا، چنانچہ اس نے خلیفہ کی طرف سے بے توجہی کی خاطر سخت رویہ اختیار کیا اور اس نے درہم و دینار پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے لئے نازیبا الفاظ لکھ کر مسلمانوں کے بازار میں بھیجے کیونکہ اس زمانہ میں درہم و دینار روم میں بنائے جاتے تھے۔

جب عبد الملک نے یہ حال دیکھا تو امام علیہ السلام سے مشورہ کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس سلسلہ میں آپ کو شام دعوت دی چنانچہ امام علیہ السلام نے مصلحت کے تحت اس دعوت کو قبول کیا اور آپ شام تشریف لے گئے اور جب عبد الملک نے آپ کے سامنے مشکل بیان کی تو آپ نے فرمایا کہ صنعت گروں کو بلایا جائے، خلیفہ نے ان سب کو حاضر کر لیا تب امام علیہ السلام نے ان لوگوں کو بتایا کہ کس طرح درہم و دینار کا سانچہ بنائیں، کس طرح ان کی مقدار معین کی جائے اور کس طرح ان پر کچھ تحریر کیا جائے، چنانچہ امام علیہ السلام نے اس طریقہ سے مسلمانوں کو رسوائی سے بچالیا اور بادشاہ روم ناکام ہو گیا [76]

امام علیہ السلام کے بے شمار شاگرد تھے آپ کی میراث وہ گرانبھا ذخیرہ ہے جس سے تفسیر، فقہ، حدیث، کلام اور تاریخی کتب بھری ہیں، آپ کی شہادت ذی الحجہ ۱۱۲ھ [77] مدینہ منورہ میں ہوئی اور آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

چھٹے امام : حضرت جعفر صادق علیہ السلام

آپ کا مشہور و معروف لقب ”صادق“ ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۷/ ربیع الاول ۸۳ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

آپ کے زمانے میں اموی سلطنت کمزور ہو گئی یہاں تک کہ بالکل ہی اس کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد عباسی حکومت تشکیل پائی چنانچہ عباسی حکومت اپنے نئے منصوبوں کو تیار کرنے میں مشغول تھی لہذا امام علیہ السلام نے موقع غنیمت شمار کیا اور وسیع پیمانہ پر تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے، آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ایسے ایسے شاگرد جو بعد میں اسلام کی مشہور و معروف شخصیتیں بن گئیں۔ آپ(ع) کے شاگرد اور آپ سے احادیث روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ لوگوں کی زبان پر شیعیت کے بجائے ”مذہب جعفری“ گردش کرنے لگا، اور اس مذہب کو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب کرنے لگے جبکہ تشیع تمام اہل بیت (ع) سے منسوب ہے اور کسی ایک امام سے مخصوص نہیں ہے۔

امام علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں کس قدر دینی خدمات انجام دیں ہیں اس کے لئے کافی ہے کہ ہم بعض تاریخوں میں آپ کے شاگردوں اور رواۃ کی تعداد کو ملاحظہ کریں جن کی تعداد چار ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ [78] اسی طرح ابو الحسن و شاء کہتے ہیں کہ :

”میں نے اس مسجد (کوفہ) میں ۹۰۰ راویوں کو دیکھا جو کہتے تھے: ”حدثنی جعفر بن محمد(ع)“ (مجھ سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا) [79]

اسی طرح ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم امام علیہ السلام کی بعض باقی باندہ علمی میراث کو دیکھیں اور امام علیہ السلام کی عظمت و بلندی کا اندازہ لگائیں۔

اگر آپ کی تفسیر قرآن، علم فقہ، فلسفہ اور علم کلام وغیرہ کو ایک ساتھ جمع کیا جائے تو ایک بے نظیر عظیم الشان دائرۃ المعارف بن جائے گا۔

آپ کے علمی آثار میں سے :

طبی قوانین اور صحت سے متعلق دستور جن کو دو کتابوں میں جمع کیا گیا ہے۔

”توحید المفضل“ اور ”الاهلیجہ“ [80]

ان دونوں کتابوں میں مسئلہ ”عدوی“ (جس کے ذریعہ ”مکروب“ ”Microbe“ کی شناخت ہوتی ہے) کے بارے میں مکمل طریقہ سے وضاحت کی گئی ہے۔

اسی طرح علم الامراض کے بارے میں مکمل طور پر وضاحت کی گئی ہے، امام علیہ السلام نے سب سے پہلے **دورۃ الدمویۃ** تھرما میٹر ”Thermometer“ کشف کیا اس کے بعد کہیں ڈاکٹر ”ہارفی بقرون“ نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔

آپ ہی نے جابر بن حیان کو علم کیمیا (Chemistry) کی تعلیم دی اسی وجہ سے آپ کو علم کیمیا کا موجد کہا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر محمد یحیٰ الہاشمی کہتے ہیں۔ [81]

امام علیہ السلام کے طریقہ کار کے بارے میں استاد ”ڈونالڈسن“ نے تدریس کے طریقہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے: ”آپ کی روش تدریس سقراطی تھی آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ بحث و مباحثہ کرتے تھے اور خالص او رسادہ موضوعات سے اپنی گفتگو کا آغاز فرما کر دقیق، علمی، پیچیدہ اور مشکل موضوعات پر بحث ختم فرماتے تھے۔ [82]

آپ کی شہادت ۱۴۸ھ [83] کو مدینہ منورہ میں ہوئی اور آپ کو بھی جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

ساتویں امام : حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام

آپ کے دو مشہور لقب ”کاظم“ اور ”باب الحوائج“ تھے ۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۸ھ کو مقام ”ابواء“ (مدینہ کے قریب ایک مقام) میں ہوئی۔

آپ کی زندگی بنی عباس سلطنت کے زیر اثر مشکلات سے دوچار رہی ہے۔

آپ کی زندگی کس قید خانہ میں گذری ہے اس کا بیان کرنا مشکل ہے ہارون الرشید آپ کا سخت مخالف تھا اس کا سبب بھی بعض مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ جس وقت ہارون الرشید مدینہ منورہ میں داخل ہو کرمسجد النبی میں زیارت کے لئے گیا اور چونکہ اس نے قبر نبوی پر توجہ دی تو مدینہ کے زعماء اور سردار اس کو تحفے دینے کے لئے گئے اور رجب ہارون قبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر حاضر ہوا تو اس طرح سلام کیا:

”السلام علیک یا ابن العم“

(اے میرے چچازاد بھائی تم پر سلام ہو)

اس کا یہ سلام لوگوں کو فریب دینے کے لئے تھا تاکہ لوگ اس قریبی رشتہ داری کو دیکھ کر اس کو خلافت کا مستحق مان لیں، لیکن جب امام علیہ السلام نے اس مکر و فریب کو دیکھا تو اس کو بے نقاب کر دیا اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو مخاطب کر کے کہا:

”السلام علیک یا ابہ“

(اے پدر بزرگوار تم پر سلام ہو)

یہ سن کر ہارون الرشید کا سر شرم کی وجہ سے جھک گیا اور اس پر کینہ و کدورت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ اس کے بعد سے امام علیہ السلام اور ہارون الرشید میں بہت سے مناظرات ہوئے کہ کون رسول اللہ سے زیادہ قریب ہے، ہارون الرشید کی دلیل یہ تھی کہ لڑکی کی اولاد ”ذریۃ“ اور اس کے اولاد نہیں ہوتی۔ کیونکہ ذریۃ اور ابناء صرف باپ کے ذریعہ منسوب ہوتے ہیں ماں کے ذریعہ نہیں۔

لیکن امام علیہ السلام نے ہارون الرشید کو وہ دندان شکن جوابات دئے جن کی وجہ سے اس کو منہ کی کھانی پڑی، ان میں سے بعض کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اب تک زندہ ہوتے تو تیری بیٹی سے نکاح کرسکتے تھے لیکن میری بیٹی سے ہر گز یہ قصد نہ کرتے۔

۲۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

[84]

”پھر جب تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (نصرانی) جناب عیسیٰ (ع) کے بارے میں حجت کرے تو کہو کہ (اچھا میدان میں) آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔۔۔۔“ اور اس بات کو تمام مسلمان جانتے ہیں کہ آپ نے مباہلہ میں بیٹوں کی جگہ امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو لیا جو آپ کی بیٹی کی اولاد ہیں اور قرآن کریم نے ان دونوں کو ابناء (بیٹے) کہا۔ قرآن مجید نے جناب ابراہیم علیہ السلام کی زبانی نقل کیا:

[85]

”اور ان ہی (ابراہیم) کی اولاد سے داؤد، سلیمان و ایوب و یوسف و موسیٰ و ہارون (سب کی ہم نے ہدایت کی) اور نیکوکاروں کو ہم ایسا ہی صلہ فرماتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ (ع۔۔۔)“

اور جناب عیسیٰ (ع) بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن قرآن کریم نے ان کو ماں کی طرف سے ذریۃ ابراہیم علیہ السلام میں شمار کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ماں کی طرف سے ذریۃ میں شامل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن

کریم اس بات کو صاف طور پر بیان کیا ہے۔

یہ تمام چیزیں سن کر ہارون الرشید شرمندہ ہو گیا لیکن اس کے دل میں بھرا بغض و حسد ظاہر ہونے لگا جس کی بنا پر امام علیہ السلام پر مصائب پڑنے لگے اور آپ کو قید خانہ میں بھیج دیا گیا اور اس پر بھی ہارون کو سکون نہ ملا بلکہ امام کو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ میں بھیج دیتا تھا لہذا امام علیہ السلام کو تعلیم و تربیت کا موقع کم ملا ہے۔

لیکن پھر بھی آپ نے اپنی آزاد زندگی میں وہ عظیم علمی آثار چھوڑے ہیں جو اسلام کے عظیم منابع میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ (ع) کی شہادت شب ۲۵ رجب ۱۸۳ھ [86] کو ہوئی اور آپ کو قریش کے قبرستان میں دفن کیا گیا جس کو آج کل کاظمیہ (کاظمین) کہا جاتا ہے جو امام علیہ السلام سے منسوب ہے)

آٹھویں امام : حضرت علی رضا علیہ السلام

آپ (ع) کا مشہور لقب ”رضا“ ہے۔

آپ (ع) کی ولادت باسعادت ۱۱ / ذیقعدہ ۱۲۸ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

آپ (ع) کے زمانہ میسب سے پہلے عباسی خلیفہ بنا او رآپ اپنے پدر بزرگوار پر پڑنے والی تمام مشکلات میں شریک تھے، جس وقت مامون کو خلافت ملی تو اسلامی علاقوں میں بہت سی اہم مشکلات پیدا ہو گئیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

امین و مامون کے درمیان ہوئی جنگ کے نتیجہ میں حکومت کی ساکھ کمزور پڑ گئی اور چونکہ مامون نے ایران کو دار السلطنت بنالیا تھا لہذا عباسی افراد اور ان کے طرفدار برائی کیا کرتے تھے اور اسی طرح علویوں کی طرف سے مکہ مکرمہ، یمن، کوفہ، بصرہ اور خراسان سے قیام ہوئے۔

چنانچہ ان تمام مشکلات کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ مامون پریشان رہتا تھا چنانچہ اس کو کوئی چارہ کار دکھائی نہ دیا مگر یہ کہ امام علیہ السلام کو ”مرو“ (خراسان کا ایک علاقہ) میں بلالیا اور جب آپ سے ملاقات ہوئی تو خلافت آپ کے سپرد کرنے کی پیش کش کی، (لیکن امام علیہ السلام نے قبول نہیں کی) اس کے بعد مامون نے ولی عہدی کے لئے بہت اصرار کیا (چنانچہ امام علیہ السلام نے مجبوراً و مصلحتاً قبول کر لیا) مامون اس کام کے ذریعہ موجودہ حالات سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا خصوصاً عالم اسلام کے بعض مناطق میں حکومت کی مخالفت میں قیام ہو چکے تھے۔ لہذا اس حکومت میں امام رضا علیہ السلام کی شرکت (اگرچہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو) بھڑکے ہوئے آگ کے شعلوں کو خاموش کرنے میں مددگار ثابت ہوئی، کیونکہ ان مناطق میں حب آل علی پائی جاتی تھی اور چونکہ امام علیہ السلام اولاد علی میں سے تھے لہذا ان کا قیام ختم ہو گیا۔ امام علیہ السلام جانتے تھے کہ مامون کا اصرار صرف ایک چال ہے کیونکہ یہی مامون مستقبل میں میرے خلاف ایک زبردست مہم چلائے گا یا بعض علویوں کے ضمیروں کو خرید کر اس تحریک کا علمدار بنادے گا۔ لیکن امام علیہ السلام اس علم کے باوجود یہ احساس کر رہے تھے کہ اگر اس پیش کش (ولی عہدی) کو قبول نہ کیا تو باعث عسر و حرج ہوگا کیونکہ اگر آپ قبول نہ کرتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ آپ اصلاً مستحق خلافت نہیں ہیں یا خلافت کی مہار سنبھالنے کی لیاقت نہیں رکھتے۔

اسی وجہ سے امام علیہ السلام نے ولی عہدی کو قبول کر لیا تاکہ مامون کا امتحان لیا جاسکے اور اس کو آزماسکیں۔

چنانچہ امام علیہ السلام رسمی طور پر ولی عہد ہو گئے۔

اس کے بعد بہت سے واقعات رونما ہوئے اور امام علیہ السلام کی وفات ایسے حالات میں ہوئی جن کو دیکھ کر انسان شک میں پڑ جاتا ہے (اور وہ یہ کہ آپ کی شہادت مامون کے ذریعہ ہوئی ہے) لیکن ان تمام تفصیلات کو یہاں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔

امام علیہ السلام کے علمی آثار وہ عظیم مجموعہ ہے جن کا اسلامی منابع میں شمار ہوتا ہے ان میں سے ایک رسالہ جس کو مامون کے لئے لکھا تھا جس کا نام ”الذہبیہ“ تھا جو طبی مسائل میں تھا اور ”طب الرضا“ کے نام سے مشہور ہوا، اس رسالہ کی شرح ڈاکٹر زینی صاحب نے کی ہے، اور اس رسالہ کے مطالب اور علم طب کے درمیان مقایسہ کیا ہے، چند سال قبل یہ رسالہ بغداد سے شایع ہو چکا ہے۔

آپ کی شہادت صفر ۳۰۳ھ [87] کو طوس میں ہوئی اور طوس (خراسان) میں دفن ہوئے ہیں، آج آپ کے مدفن کو ”مشہد“ کہا جاتا ہے۔

نویں امام : حضرت محمد تقی علیہ السلام

آپ کے دو مشہور لقب تھے ”جواد“ اور ”تقی“، آپ کی ولادت باسعادت رمضان المبارک ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی، آپ نے خلیفہ مامون کے زمانہ میں اپنی زندگی کا آغاز کیا وہ مامون جو اہل بیت (ع) اور ان کی ولایت کا جھوٹا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اور جس وقت امام رضا علیہ السلام کی وفات واقع ہوئی تو لوگوں کی زبان پر امام علیہ السلام کے قتل کا الزام مامون پر لگایا جا رہا تھا چنانچہ مامون نے اس افواہ کو جھوٹا ثابت کرنے اور عملی طور پر دلیل قائم کرنے کی کوشش کی اور اس نے امام تقی علیہ السلام سے محبت کا اظہار کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل سے آپ کی شادی کرنے کا ارادہ کیا تاکہ دونوں خاندانوں میں جدید رشتہ داری کی بنا پر محبت پیدا ہو جائے، لیکن اس کام کے لئے دوسرے عباسیوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کی اور اصرار کیا کہ اس شادی سے صرف نظر کرے اور یہ مطالبہ کیا کہ علویوں کے ساتھ گزشتہ خلفاء کا رویہ اختیار کرے یعنی ان کے ساتھ جنگ و دشمنی کی جائے، لیکن مامون نے ان کی یہ بات نہ سنی اور ان کو جنگ و دشمنی سے روکا کیونکہ اسے آل علی (ع) سے قطع تعلق کی کوئی خاص وجہ نہیں دکھائی دی اور ان کے سامنے وضاحت کی کہ اپنی بیٹی کی شادی کسی عارفہ اور محبت کی بنا پر نہیں کر رہا ہوں بلکہ امام علیہ السلام کی شخصیت و فضیلت تمام علماء اور ماہرین پر واضح ہے درحالیکہ ان کا سن بھی کم ہے۔

لیکن جب ان لوگوں نے مامون کو اپنے فیصلہ پر مصمم پایا تو کہا کہ امام علیہ السلام کو مزید علم وفقہ میں مہارت حاصل کرنے دو اس وقت مامون نے کہا: ”یہ اہل بیت (ع) کی ایک فرد ہیں ان کا علم خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو ان کا امتحان کرلو تاکہ تم پر بھی حقیقت واضح ہو جائے۔“

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ امام علیہ السلام کا امتحان لیا جائے اور ان میں سے بعض لوگ امتحان کے لئے تیار ہو گئے، اور قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کو آمادہ کیا کہ وہ امام علیہ السلام سے سوال کر کے شکست دیدے، چنانچہ امتحان کی تاریخ پہنچ گئی اور امام و یحییٰ بن اکثم کے درمیان مناظرہ ہوا جس کے نتیجہ میں یحییٰ بن اکثم کو منہ کی کھانی پڑی اور امام علیہ السلام کی شخصیت فقہ اسلامی کے میدان میں روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی، اس مناظرہ میں امام علیہ السلام کی قابلیت کو دیکھ کر مامون نے اپنی لڑکی سے شادی کردی اور امام و مامون کے درمیان تعلقات بہتر ہو گئے۔ (ظاہراً)

لیکن جب مامون کے بعد معتصم کو خلافت ملی تو اس نے امام علیہ السلام کو بغداد بلالیا اور آپ کو ایک مخصوص گھر میں رکھا گیا لیکن آپ کی وفات ان مبہم حالات میں ہوئی جن کی بنا پر معتصم پر الزام لگایا جانے لگا کہ اس نے ام الفضل کے ذریعہ امام علیہ السلام کو زہر پلایا۔ اور چونکہ امام علیہ السلام معتصم کے زیر نظر تھے لہذا بغداد کے ان حالات میں بھی امام علیہ السلام نے وہ علمی آثار چھوڑے جن سے مشہور اسلامی کتابیں منور ہیں۔ آپ کی شہادت ذی الحجہ ۲۲۰ھ [88] میں ہوئی اور آپ کو آپ کے دادا کے پاس ”کاظمیہ“ (کاظمین) میں دفن کیا گیا۔

دسویں امام : حضرت علی نقی علیہ السلام

آپ ”نقی“ اور ”ہادی“ کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۵/ ذی الحجہ ۲۱۲ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ کی کچھ زندگی معتصم کے زمانہ میں گذری اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں ”سرمن رائے“ تشکیل پائی کیونکہ اس زمانہ میں ترکوں اور رمالک نے حکومت اسلامی کے لئے بہت سی مشکلیں ایجاد کردی تھیں لہذا معتصم ان مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ اس کے بعد واثق کا زمانہ آیا یہ وہ زمانہ تھا جس میں امام علیہ السلام اور خلیفہ کے درمیان اچھے تعلقات رہے ہیں۔

اس کے بعد متوکل کا زمانہ آیا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جس میں اہل بیت (ع) سے علی الاعلان دشمنی اور مقابلہ کیا جانے لگا اور لوگوں کو ان سے منحرف کیا جانے لگا۔ اور جب مدینہ میں متوکل کے والی کو امام علیہ السلام کی شان و شوکت کو دیکھ کر اپنی حکومت کے ڈگمگانے کا خوف لاحق ہوا تو اس نے متوکل کو خط لکھ کر آگاہ کیا کہ امام علیہ السلام تیری حکومت کے خلاف انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

جب ان تقاریر کا سلسلہ بڑھنے لگا تو متوکل نے امام علیہ السلام کو خط لکھ کر سرمن رائے بلایا تاکہ آپ اور آپ کے اہل بیت وہاں پر رہیں تاکہ لوگوں کا رجحان آپ کی طرف سے ہٹ جائے اور والی مدینہ کو لکھا کہ امام علیہ السلام کے ساتھ کچھ محافظین بھیجے تاکہ امام علیہ السلام کے احترام و اکرام کا مزید مظاہرہ ہوسکے۔ چنانچہ امام علیہ السلام نے ان حالات کو دیکھ کر سفر کا ارادہ کرلیا اور سرمن رائے جانے کے لئے رختِ سفر باندھ لیا اور جب امام علیہ السلام متوکل کے تیار کردہ مکان میں پہنچے، چند روز رہنے کے بعد آپ نے اس کا مکان چھوڑ دیا اور اپنے مال سے ایک مکان خریدا تاکہ خلیفہ کے مہمان بن کر نہ رہیں، یہی وہ مکان تھا جس میں آپ کو دفن بھی کیا گیا، جو آج بھی لاکھوں افراد کی زیارت گاہ ہے۔

امام علیہ السلام نے مجبوراً سرمن رائے میں قیام فرمایا، یہاں تک کہ آپ کی شہادت واقع ہوئی کیونکہ ہمیشہ آپ کے خلاف سازش ہوتی رہی اور آپ کو ہر طرح کی اذیت دی جانے لگی، اس جرم میں کہ یہ ہماری حکومت کے خلاف انقلاب لانا چاہتے تھے اور ہماری حکومت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے۔

ان تمام حالات کے بعد بھی خلیفہ کو جب بھی کوئی شرعی مشکل پیش آتی تھی تو وہ امام علیہ السلام کے پاس آکر پناہ لیتا تھا کیونکہ خلیفہ میں مسائل شرعی سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی وہ شرعی سوالات کا جواب دے سکتا تھا۔

امام علیہ السلام کے علمی آثار نفیس و قیمتی ہیں جن میں ”جبر و تفویض“ کے موضوع پر بہترین رسالہ ہے جس میں مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی اور اس میں موجود ہ پیچیدگیوں کا مکمل حل بیان کیا گیا ہے خلاصہ یہ کہ اس مسئلہ میں مکمل وضاحت کی گئی ہے او رآپ کے جد امجد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول: ”لا جبر ولا تفویض ، بل امر بین الامرین“ [89] کی مکمل شرح کی گئی ہے۔

آپ کی شہادت رجب ۲۵۴ھ [90] کو سامرہ میں ہوئی اور آپ کو اپنے ہی گھر میں دفن کیا گیا جو ہزاروں مومنین کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔

گیارہویں امام : حضرت حسن عسکری علیہ السلام

آپ ”عسکری“ کے نام سے مشہور تھے ، عسکری ”عسکر“ کی طرف منسوب ہے جو سرمن رائے کے ناموں میں سے ایک نام تھا۔

آپ کی ولادت باسعا دت ربیع الاول ۲۳۲ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

آپ کی حیات طیبہ میں درج ذیل حکام کا زمانہ تھا:

- ۱۔ خلیفہ المعتز ؛ اس زمانہ میں خلیفہ اور امام کے درمیان کوئی دشمنی یا سازش نہیں تھی کیونکہ اس زمانہ میں تُرک لشکر نے خلیفہ کے لئے بہت سی مشکلیں ایجاد کر رکھی تھیں ، اس کی حکومت میں تباہ کاری و خرابکاری کر رکھی تھی اور خلیفہ ان مشکلات سے دست و پنچہ نرم کر رہا تھا لیکن آخر کار خلیفہ کو خلافت سے معزول ہونا پڑا۔
- ۲۔ خلیفہ مہتدی؛ اس کے امام علیہ السلام کے ساتھ اچھے روابط تھے اور اسی وجہ سے خلیفہ شراب، محفلِ رقص و سرور سے دور تھا اور نیکی و خیر کا مظاہرہ کرتا تھا۔
- ۳۔ خلیفہ معتمد ؛ یہ خلیفہ اہل بیت (ع) کا سخت دشمن تھا اسی وجہ سے اس نے امام علیہ السلام کو ایک مدت تک قید خانہ میں رکھا لیکن مجبور ہو کر امام علیہ السلام کو آزاد کرنا پڑا کیونکہ اس وقت کے نصاریٰ نے خلیفہ سے کچھ علمی سوالات کر لئے تھے چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے اور نصاریٰ کے کھوٹے پن کو ظاہر کرنے کے لئے امام علیہ السلام کی مدد لی جیسا کہ تاریخی کتابیں اشارہ کرتی ہیں۔

جس وقت امام علیہ السلام کی وفات کی خبر ملی تو وہ نگران تھا کیونکہ اس وقت ”محمد“ مہدی بن امام عسکری علیہما السلام کی بحث شروع ہو چکی تھی اور اس سلسلہ میں امام مہدی علیہ السلام کے چچا جعفر بن علی میں حسد و کینہ بھرا ہوا تھا او رآپ کے مال و منال او رآپ کے مقام کی طرف چشم طمع لگائے ہوئے تھا، اور اپنے بھتیجے (امام مہدی (ع)) کو تلاش کرنا چاہتا تھا لیکن یہ اور خلیفہ دونوں اپنے ارادوں میں ناکام ہو گئے اور امام مہدی دشمنوں کی نظروں سے مخفی رہے اور خداوند عالم نے ان کو حاسدوں کے حسد سے نجات دی۔ حالانکہ امام حسن عسکری علیہ السلام کا زمانہ پُر آشوب تھا لیکن پھر بھی راویوں نے بہت سی روایات نقل کی ہیں جو علم و معرفت میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

آپ کی شہادت ۸/ربیع الاول ۲۶۰ھ [91] کو سرمن رائے میں ہوئی اور آپ کو اپنے پدر بزرگوار کے جوار میں (آپ کے ہی مکان میں) دفن کیا گیا۔

بارہویں امام: حضرت محمد بن الحسن (مہدی منتظر) (عج)

آپ کے ”مہدی“ اور ”القائم المنتظر“ دو مشہور و معروف لقب ہیں ۔

آپ کی ولادت با سعادت ۱۵/شعبان المعظم ۲۵۵ھ کو فجر کے وقت سامراء میں ہوئی۔

جب حکومت وقت نے آپ کے پدربزرگوار کی وفات کے وقت آپ کے بارے میں سنا تو آپ کو تلاش کیا گیا، لیکن آپ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

آپ نے غیبت صغریٰ میں کچھ مخصوص افراد منتخب کئے جو شیعوں کے مسائل اور رسوالات کو امام سے جا کر بیان کرتے اور ان کے جواب لاتے تھے۔

اور جب اس غیبت میں بھی خطرہ درپیش آیا تو پھر ملاقات کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا اور آپ مکمل طور پر پوشیدہ ہو گئے یہاں تک کہ آپ کے نائبین بھی نہ مل سکے، (اور امام علیہ السلام آج تک مخفی ہیں) انشاء اللہ ایک روز آئے گا جب خداوند عالم آپ کو ظہور کا حکم دے گا اور آپ ظلم و جور سے بھری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ آپ کے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے بہت سی احادیث میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے؛ مثلاً:

”ان علیا وصیہ ومن ولده القائم المنتظر المہدی الذی یملاء الارض قسطاً وعدلاً کما ملئت جوراً وظلماً“

(بے شک علی میرے وصی ہیں اور ان ہی کی اولاد میں سے مہدی منتظر ہوں گے جو ظلم و جور سے بھری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے)

ایضاً

: ”ابشروا بالمہدی رجل من قریش من عترتی تخرج فی اختلاف من الناس وزلزال، فیملاء الارض عدلاً وقسطاً کما ملئت ظلماً وجوراً“ [92]

(اے لوگو! میں تم کو مہدی کے بارے میں بشارت دیتا ہوں جو قریش سے ہوں گے جب لوگوں میں اختلاف اور لغزشیں پائی جائیں اسی وقت ان کا ظہور ہوگا اور وہ ظلم و جور سے بھری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے)

قارئین کرام! چونکہ موضوع امام مہدی ایک اہم موضوع ہے لہذا اس سلسلہ میں ایک مستقل باب میں بحث کرتے ہیں اور اس باب میں تین مرحلوں میں بحث کریں گے:

۱۔ نظریہ ”مہدویت“ اور اس کا اسلام سے رابطہ۔

۲۔ مسلمانوں کے درمیان متفقہ احادیث نبوی میں امام مہدی کی شناخت اور تعین۔

۳۔ امکان غیبت اور اس کے دلائل۔

لہذا اس سلسلہ میں تفصیلی معلومات کے لئے آئندہ باب میں رجوع فرمائیں۔

قارئین کرام! بحث ”امامت“ عقل و روایات کی روشنی میں آپ نے ملاحظہ فرمائی اور امامت کے سلسلہ میں

”احادیث“ صاف اور واضح طور پر ملاحظہ کیں۔

نیز ائمہ (ع) کی پاک و پاکیزہ زندگی، سیرت اور علمی عظیم آثار پر بھی توجہ فرمائی۔ کیا ان سب حقائق کو پڑھنے

کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شیعہ یہودیوں کے پیروکار ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں؟!

اسی طرح گذشتہ وضاحت کے بعد بھی کیا کوئی یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ شیعیت کا ظہور خلافت عثمان

بن عفان کے زمانہ میں ہوا، اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے قیام کیا۔

کیا عبد اللہ بن سبا کو شیعیت کا مؤسس کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اسلام کا لبادہ پہن کر اسلام کو نابود کرنے کی کوشش کی؟!

اور کیا تاریخ میں عبد اللہ بن سبا کا وجود ہے جس کی طرف شیعیت کی ایجاد کی نسبت دی جائے؟!

اب ہم اس سلسلہ میں مورخین کے نظریات قلمبند کرتے ہیں:

- ۱۔ ڈاکٹر برنارڈ لویس نے عبد اللہ بن سبا کا وجود صرف خیالی بتایا ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ مختلف زمانے میں ابن سبا کی طرف نسبت دینا متاخرین علماء کی من گھڑت کہانی ہے۔ [93]
- ۲۔ ڈاکٹر طہ حسین صاحب نے ابن سبا کی طرف منسوب تمام واقعات کو نا قابل قبول مانا ہے اور مورخین کی روایات پر حاشیہ لگاتے ہوئے کہا:

”شیعوں پر یہ سب تہمتیں، شیعہ مخالفین اور شیعہ دشمنوں نے لگائی ہیں۔“ [94]

- ۳۔ ڈاکٹر جواد علی صاحب نے عبد اللہ بن سبا کی تمام باتوں کو مشکوک قرار دیا ہے کیونکہ اس کی تمام روایتیں سیف بن عمرہ سے ہیں اور اس کے علاوہ کسی نے بھی بیان نہیں کی جبکہ سیف بن عمرہ خود بھی اور اس کی روایات بھی غیر قابل قبول ہیں۔ [95]

- ۴۔ ڈاکٹر علی الوردی صاحب کا نظریہ ہے کہ اموی حکام نے جلیل القدر صحابی جناب عمار بن یاسر کو عبد اللہ بن سبا کا لقب دیا ہے اور اس پر بہت سے قرائن وشواہد ہیں۔ [96]

۵ استاد احمد عباسی صالح صاحب کی نظر میں عبد اللہ بن سبا کا وجود ایک افسانہ ہے، جیسا کہ موصوف اپنی گفتگو کے دوران فرماتے ہیں:

”اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ عبد اللہ بن سبا ایک خرافی تصور کا نام ہے اور لوگوں نے اس خرافی شخص کا وجود اس لئے تصور کیا کہ اس کی طرف جو کچھ بھی نسبت دینا چاہیں وہ دے سکیں، چنانچہ عبد اللہ بن سبا کے جو واقعات موجود ہیں وہ سب متاخرین کی من گھڑت کہانیاں ہیں کیونکہ قدیمی منابع اور کتابوں میں اس کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ہے چہ جائیکہ اس کے نظریات کا کوئی وجود بھی ہو“ [97]

پس خلاصہ یہ ہوا کہ عبد اللہ بن سبا صرف ایک افسانہ ہے جس کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا تو پھر حقیقت میں شیعیت کی بنیاد رکھنے والا کون ہے؟ اور کس نے سب سے پہلے اس لفظ کو استعمال کیا؟

جواب

: سب سے پہلے اس لفظ کو حضرت رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے استعمال کیا جیسا کہ طبری اور حافظ ابن حجر نے اپنے مشہور حفاظ سے اس روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اس آیہ ۱ کریمہ کی تلاوت فرمائی:

[98]

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے ہیں یہی لوگ بہترین خلائق ہیں“

اور اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

”ہم انت وشیعتک“ [99] (وہ آپ اور آپ کے شیعہ ہیں)

اب جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ سب سے پہلے اس کلمہ کا استعمال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے کیا اور شیعہ سے مراد حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں کو لیا تو پھر خود غرض اور شک کرنے والوں کے بے جا

اعتراضات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بَدَاْنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ بَدَاْنَا اللّٰهُ۔

والسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين ۔

- [1] لسان العرب ج ۱۲ ص ۲۴ (ماده اءم
- [2] سورة بقره آیت ۱۲۴۔
- [3] سورة احقاف آیت ۱۲۔
- [4] سورة فرقان آیت ۷۴۔
- [5] سورة اسراء آیت ۷۱۔
- [6] لسان العرب ج ۹ ص ۸۳، ۸۲، ۸۹ (ماده خلف)۔
- [7] سورة بقره آیت ۳۰۔
- [8] سورة ص آیت ۲۶۔
- [9] سورة انعام آیت ۱۶۵۔
- [10] سورة اعراف آیت ۶۹۔
- [11] الاحكام السلطانية ص ۳۔
- [12] مقدمه ابن خلدون ص ۱۵۹۔
- [13] مقدمه ابن خلدون ص ۱۸۳۔
- [14] نظرية الامامة ص ۲۲۔
- [15] نظرية الامامة ص ۲۴۔
- [16] نظرية الامامة ص ۲۰۔
- [17] همارى كتاب "مفاهيم اسلامى" ميں "الاسلام دين ودولة" عنوان پر رجوع فرمائیں۔
- [18] ڈاکٹر احمد محمود صبحی کہتے ہیں : ابوبکر وعمر کی خلافت ایک وقتی مسئلہ تھا تاکہ احتمالی فتنہ وفساد رونما نہ ہونے پائے اور ان کی حکومت، کامل نظام کی بنیاد کے لئے نہیں تھی۔ (نظرية الامامة ص ۲۶)
- [19] سورة قصص آیت ۶۸۔
- [20] لسان العرب ج ۱۲ ص ۴۰۳ (ماده عصم)۔
- [21] سورة بقره آیت ۲۲۹۔
- [22] سورة طلاق آیت ۱۔
- [23] سورة بود آیت ۱۸۔
- [24] سورة مريم آیت ۷۲۔
- [25] سورة مريم آیت ۷۲۔
- [26] سورة بقره آیت ۱۲۴۔
- [27] نظرية الامامة ص ۱۳۵ تا ۱۳۹۔
- [28] یہ بات قابل توجہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وفات کے بعد انتخاب کے قائل تھے لیکن جناب ابوبکر نے اپنے بعد نص (جناب عمر کی خلافت کی وضاحت) کی تو پھر انہوں نے بھی نص کے

بارے میں کہنا شروع کردیا اور علت یہ بیان کی کہ عام حالت میں نص ہی کے ذریعہ اپنے بعد والے کو معین کرتے ہیں لیکن چونکہ اس وقت فتح کی جنگ تھی (یعنی مسلمان دوسرے شہروں کو فتح کرنا چاہتے تھے) اور سرکشی و بغاوت کرنے کا خوف تھا (لہذا رسول اسلام نے کسی کی خلافت پر واضح بیان نہیں دیا) [29] سورہ آل عمران آیت ۱۴۴۔

[30] نظریۃ الامامة ص ۶۲۔

[31] سورہ شعراء آیت ۲۱۴۔

[32] اس روایت کو خلاصہ کرکے نقل کیا ہے، تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۱۹، ۳۲۱۔ مطبوع دار المعارف، مصر ۱۹۶۱ء۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب ”حیاء محمد“ ص ۱۰۴ کے پہلے ایڈیشن میں اس حدیث کو نقل کیا لیکن دوسرے ایڈیشن میں اس حدیث کو حذف کردیا، قارئین کرام اس حدیث کے مصادر اور سندوں کو کتاب الغدير ج ۲ ص ۲۵۲ تا ۲۶۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

[33] صحیح مسلم ج ۴ ص ۱۲۰، اس حدیث کی سند اور منابع کے سلسلہ میں کتاب الغدير جلد اول ص ۲۸ تا ۲۹ و ج ۳ ص ۱۷۲ تا ۱۷۶ ملاحظہ فرمائیں۔

[34] سورہ طہ آیت ۲۹۔

[35] سورہ طہ آیت ۳۰۔

[36] سورہ طہ آیت ۳۲۔

[37] سورہ اعراف آیت ۲۱۲۔

[38] نظریۃ الامامة ص ۲۲۹۔

[39] ان صحابہ، تابعین علماء، حفاظ اور رایوں کے اسماء گرامی نیز منابع حدیث کے بارے میں کتاب الغدير جلد اول مکمل طور پر ملاحظہ فرمائیں۔

[40] سورہ مائدہ آیت ۳

[41] سورہ مائدہ آیت ۶۷، اس آیت کی شان نزول کے بارے میں تفسیر ”الدر المنثور“ ج ۲ ص ۲۸۹، فتح الغدير جلد اول ص ۶۰ اور کتاب الغدير جلد اول ص ۱۹۶ تا ۲۰۹ میں ذکر شدہ کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔

[42] سد الغابہ ج ۲ ص ۲۸، البداية والنهاية ج ۵ ص ۲۰۹، ۲۱۳، اور الغدير کی پہلی جلد میں بیان شدہ کتابیں۔

[43] سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۲۳، البداية والنهاية ج ۵ ص ۲۱۰، وفيات الاعیان ج ۲ ص ۳۱۸، اور الغدير کی پہلی جلد میں بیان شدہ کتابیں۔

[44] اس آیت (سورہ مائدہ آیت ۳) کی شان نزول کے بارے میں تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۹۰، الدر المنثور ج ۲ ص ۲۵۹، اور الغدير کی پہلی جلد ص ۲۱۷ تا ۲۱۸ میں بیان شدہ کتابیں۔

[45] تاریخ بغداد جلد ۸ ص ۲۹۰، البداية والنهاية ج ۵ ص ۲۱۰، اور الغدير کی پہلی جلد میں بیان شدہ کتابیں۔

[46] نظریۃ الامامة ص ۲۲۱۔

[47] نزہۃ المجالس ج ۲ ص ۴۷۲۔

[48] منهاج السنة ج ۲ ص ۲۱۰۔

[49] تعیین امامت کے سلسلہ میں حدیث نبوت کو گذشتہ حوالوں کے علاوہ ارشاد مفید، المناقب شہر آشوب السروی، فصول المهمہ، ابن صباغ مالکی، مطالب السوال ابن طلحہ شافعی، ینابیع المودة قندوزی حنفی وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

[50] شیخ قندوزی وغیرہ نے پیغمبر اکرم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”انا سید النبیین وعلی سید الوصیین وان اوصیای بعدی اثنا عشر“ اس حدیث اور حدیث اثنا عشر کے بارے میں کتاب ینابیع المودة ص ۴۷، ۴۸، ۴۸۸، ۴۹۲، ۴۹۳ ملاحظہ فرمائیں۔

[51] صحیح بخاری ج ۹ ص ۱۰۱، صحیح مسلم ج ۶ ص ۳، سنن ترمذی ج ۴ ص ۵۰۱، سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۴۲۱، وجامع الاصول ج ۴ ص ۴۴۰ تا ۴۴۲۔

اس حدیث کے طُرُق کے بارے میں حافظ قندوزی کہتے ہیں: صحیح بخاری میں اس حدیث کو تین طریقوں سے بیان کیا گیا ہے اور صحیح مسلم میں نو طریقوں سے، سنن ابی داؤد میں دو طریقوں سے، سنن ترمذی میں ایک طریقہ سے اور حمیدی میں تین طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، رجوع فرمائیں ینابیع المودة ص ۴۲۲۔
اضافہ مترجم: یہاں پر صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ایک ایک حدیث نقل کر دینا بہتر ہے تاکہ قارئین کرام ان دونوں حضرات کی نقل کو بھی دیکھ لیں:

”...عن عبد الملك؛ سمعت جابر بن سمره؛ قال: سمعت النبی يقول: يكون اثني عشر اميرا، فقال كلمة، لم اسمعها، فقال ابی: انه قال: كلهم من قريش“

صحیح بخاری جلد ۹، کتاب الاحکام، باب ۵۲ ”استخلاف“ حدیث ۶۷۹۱۔ صحیح مسلم جلد ۱، کتاب الامارہ، باب ۱۱ ”الناس تبع القريش و الخلافة فی قريش“ حدیث ۱۸۲۱۔

ترجمہ :-...عبد الملك نے جابر بن سمرہ سے نقل کیا ہے کہ: میں نے رسول خدا سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (میرے بعد میرے) بارہ امیر و خلیفہ ہوں گے، جابر کہتے ہیں کہ: دوسرا کلمہ میں نے صحیح سے نہیں سنا جس میں آنحضرت نے ان بارہ خلفاء کے بارے میں بتلایا تھا کہ وہ کس قبیلہ سے ہوں گے، لیکن بعد میں میرے پدر بزرگوار نے مجھ سے کہا کہ: وہ جملہ جو اس نے نہیں سنا وہ یہ تھا کہ وہ تمام خلفاء قریش سے ہوں گے۔
مسلم نے بھی اس حدیث کو آٹھ سندوں کے ساتھ اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اور ان میں سے ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے:

”جابر بن سمره؛ قال: انطلقت الى رسول الله ومعى ابی، فسمعتہ، يقول: لَا يَزَالُ بِذَا الدِّينِ عَزِيزًا مَنِيْعًا إِلَىٰ اِثْنَيْ عَشَرَ خَلِيفَةً، قال كلمة، صَمَّنِيَهَا النَّاسُ، فَقُلْتُ لَابِي مَا قَالَ؟ قال: كلهم من قريش“، صحیح مسلم جلد ۱، کتاب الامارہ، باب ۱ حدیث ۱۸۲۱، کتاب الامارہ کی حدیث نمبر ۹۔

ترجمہ :-...جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ: ایک مرتبہ میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ خدمت رسول خدا سے مشرف ہوا تو میں نے رسول سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے کہ: یہ دین الہی بارہ خلفاء تک عزیز اور غالب رہے گا، اس کے بعد دوسرا جملہ میں نہ سن سکا کیونکہ صدائے مجلس سننے سے حائل ہو گئی تھی، لیکن میرے پدر بزرگوار نے کہا: وہ جملہ یہ تھا کہ: تمام یہ بارہ خلفاء قریش سے ہوں گے۔ (مترجم)۔

[52] صحیح مسلم ج ۶ ص ۴۔

[53] حلیۃ الاولیاء جلد اول ص ۶۳۔

[54] الارشاد، شیخ مفید ص ۳۔

[55] سب سے پہلے مسلمان کو تعین کرنے کے سلسلہ میں کتاب الغدير ج ۳ ص ۱۹۲ تا ۲۰۹ پر رجوع فرمائیں کیونکہ وہاں پر ۱/۶۱ اصحاب اور تابعین کے اقوال نقل کئے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام ہی سب سے پہلے مسلمان ہیں۔

[56] جناب فاطمہ زہرا (ع) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی اکلوتی بیٹی تھیں اس سلسلہ میں باب

نبوت ص ۲۲۳/ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[57] چنانچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پیشین گوئی کی تھی کہ خوارج آپ سے جنگ کریں گے ،
مراجعہ کریں تاریخ بغداد ج ۸ ص ۳۴۰، وج ۱۲ ص ۱۸۷، والاستیعاب ج ۳ ص ۵۳۔

[58] اس شب میں آپ کی شہادت کے سلسلہ میں مروج الذهب ج ۲ ص ۲۹۱، الکافی جلد اول ص ۴۲۵، ارشاد
ص ۶، اور جیسا کہ طبری نے اپنی تاریخ ج ۵ ص ۱۴۳ میں بیان کیا ہے کہ عبد الرحمن بن ملجم نے آپ کو ۱۷ ویس
۹۱ویں کی شب کو ضربت لگائی اور ضربت کے بعد آپ دو دن تک زندہ رہے لہذا طبری کی ایک روایت کے مطابق
۲۱ویں شب کو آپ کی شہادت واقع ہوئی۔

[59] نزبة المجالس ج ۲ ص ۴۷۶۔

[60] سنن ترمذی ج ۵ ص ۶۵۶۔

[61] ایضاً ج ۵ ص ۶۵۸۔

[62] عقيدة الشيعة ص ۹۰۔

[63] اهل البيت ص ۲۸۰ تا ۲۸۲۔

[64] اهل البيت ص ۲۸۲۔

[65] نظرية الامامة ص ۲۸۲ تا ۳۲۸۔

[66] الولادة والوفات از ارشاد ص ۱۹۱ و ص ۱۹۷۔

[67] صلح حسن، ص ۲۵۹۔

[68] المناقب ج ۲ ص ۲۰۸۔

[69] الارشاد ، ص ۲۱۰۔

[70] العواصم من القواصم ص ۲۳۱۔

[71] نظرية الامامة ص ۳۳۶۔

[72] تاریخ ولادت و تاریخ شہادت ماخوذ از کتاب ارشاد شیخ مفید ص ۲۰۳۔ (تاریخ ولادت مولف نے ارشاد کے
مطابق پانچ شعبان بیان کی تھی جبکہ مشہور و معروف تاریخ ولادت ۳ شعبان ہے) (مترجم)

[73] الکامل ج ۳ ص ۳۱۱۔

[74] صحیفہ سجادیہ کے درج ذیل صفحات پر رجوع فرمائیں: ص ۲۵، ۳۸، ۵۶، ۸۲، ۱۰۷، ۱۶۹، ۱۹۶، ۲۳۶، ۲۶۱،
۲۶۲، ۳۰۲، اور ص ۳۰۸۔

[75] تاریخ ولادت و شہادت نقل از کتاب ”الارشاد“ شیخ مفید ص ۲۷۰۔

[76] اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے کتاب ”المحاسن والمساوی، بیہقی، ص ۲۳۲ تا ۲۳۶ تک مراجعہ
فرمائیں۔

[77] تاریخ ولادت و شہادت بنقل از الارشاد ص ۲۷۹۔

[78] المناقب ج ۲ ص ۳۲۴۔

[79] الشيعة من حياة الصادق جلد اول ص ۸۸۔

[80] یہ دونوں کتاب نجف، قاہرہ ، ایران اور بیروت سے متعدد بار چھپ چکی ہیں۔

[81] رجوع کریں کتاب ”الامام الصادق ملہم الکیما“ ڈاکٹر ہاشمی، طبع دوم سوریا ۱۹۵۸ء ۔

[82] مجلہ البلاغ ، سال دوم شمارہ دوم ص ۸۳۔

- [83] تاریخ ولادت وشہادت بنقل از الارشاد ص ۲۸۹۔
- [84] سورہ آل عمران آیت ۶۱۔
- [85] سورہ انعام آیت ۸۵، ۸۴۔
- [86] ولادت وشہادت منقول از الارشاد ص ۳۰۷۔
- [87] تاریخ ولادت وشہادت بنابر نقل الارشاد ص ۳۲۵۔
- [88] تاریخ ولادت وشہادت نقل از الارشاد ص ۳۳۹۔
- [89] یہ رسالہ مکمل طور پر تحف العقول میں نقل کیا گیا ہے ص ۳۳۱ تا ۳۵۶۔
- [90] تاریخ ولادت وشہادت منقول از الارشاد ص ۳۵۲۔
- [91] تاریخ ولادت وشہادت بنقل از الارشاد ص ۳۶۰۔
- [92] پہلی حدیث ینابیع المودۃ ص ۴۴۸، دوسری حدیث صواعق المحرقہ ص ۹۹۔ اس سلسلہ کی مزید احادیث کو سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۲۲ والحاوی ج ۲ ص ۱۲۲ تا ۱۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔
- [93] اصول الاسماعیلیہ ص ۸۶، تا ۸۷۔
- [94] الفتنة الكبرى جلد اول ص ۱۳۱، ص ۱۳۴۔
- [95] مجلة المجمع العلمی العراقی ج ۳ جز اول ص ۵۳۔
- [96] وعاظ السلاطین ڈاکٹر علی الوردی۔
- [97] الیمین والیسار فی الاسلام ص ۹۶۔
- [98] سورہ بینہ آیت ۷۔
- [99] تفسیر طبری ج ۳ ص ۲۶۵، الصواعق المحرقہ ص ۹۶، نہایہ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۲۶، الدر المنثور سیوطی ص ۳۷۹۔